تحریک آزادی اور اردو نثر

مصنف

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

وارثہ
فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

پیش لفظ

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح برطانوی سامراج کے شکنجے میں آ گیا۔ غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت نے معاشی استحصال کے علاوہ بھی ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ مغربی تہذیب کے سیلاب میں ہندوستانیوں کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی، سماجی اور اخلاقی قدریں بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم وجدید کی کشمکش میں گذری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ واقتدار کی شکل میں رونما ہوا۔

انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لئے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا، جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگِ آزادی میں تیزی اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مصمّم ارادہ کرلیا۔

تحریکِ آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو زبان وادب میں عموماً اور اردو نثر نے خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا اور آزادی کی تحریکات میں ایک نئی روح پھونکی۔ زیرِ نظر کتاب ''تحریکِ آزادی اور اُردو نثر'' ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے جو بالترتیب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب تحریک آزادی کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کو محیط ہے۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریز ہندوستان میں کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں داخل ہوئے اور انہوں نے کس طرح ملکہ الزبتھ کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں قائم کیا اور مستحکم بنایا۔ ۱۷۵۷ء کو بنگال میں نواب سراج الدولہ اور کلائیو کے مابین پلاسی کے میدان میں زبردست معرکہ ہوا۔ انگریزوں کے فریب کارانہ رویّے نیز نواب کے سپہ سالار کی سازش سے سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ اس طرح بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

زیرِ نظر باب میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب وعلل سے بحث کرتے ہوئے ان محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو انگریزوں سے ہندوستانی عوام اور سپاہ کی نفرت کا باعث بنے اور بالآخر انہوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس خونیں انقلاب کی تفصیلات کے ساتھ اس کے نتائج واثرات بھی پیش کئے گئے ہیں۔

ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر انگریزوں کے نو بہ نو مظالم کی داستان بیان کی گئی ہے نیز ان مظالم کے خلاف ہندوستان کے ردِ عمل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان تمام عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں میں تحریکِ آزادی کا جذبہ بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

باب دوم میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے آزادی ہند (۱۹۴۷ء) تک جدوجہد آزادی کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کے بعض اہم اجلاس کا ذکر بھی شامل ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں منعقد ہوئے۔ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کیوں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد کیا تھے بعد ازاں اس نے کیا صورت اختیار کی۔ ان تمام تحریکات اور حالات وواقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں عمل پذیر ہوئے اور جن کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی عوام کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک آزادی کے اس تاریخی، سیاسی پس منظر کے بیان کے بعد تیسرے باب سے کتاب کا اصل حصّہ یعنی اردو نثر کی روشنی میں تحریکِ آزادی کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصّے میں نثر کی مختلف اصناف واقسام میں تحریک آزادی کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس عظیم تحریک کے فروغ میں مختلف اصناف نیز مسلمانوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ جو بھی حصّہ رہا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب اُردو ناول سے متعلق ہے۔اس باب میں ڈپٹی نزیر احمد سے لیکر آزادیِ ہند تک ان ناول نگاروں کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تحریکِ آزادی کے فروغ کی مساعی یا جد و جہد آزادی کے آثار نظر آتے ہیں اس سلسلے میں بالخصوص پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجّاد ظہیر، عزیز احمد، وغیرہ کے ناولوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

باب چہارم میں تحریک آزادی کا مطالعہ اردو افسانوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔اس باب میں پریم چند کی گاندھی جی سے عقیدت اور تحریک آزادی سے ذہنی و عملی وابستگی نیز افسانوں کے ذریعے اس کے اظہار کی بدولت خصوصی مطالعہ کے مستحق قرار پائے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات زیرِ بحث آئی ہیں ان میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد علی شامل ہیں۔متعلقہ افسانہ نگاروں کی نگارشات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانہ اپنے محدود کینوس کے باوجود آزادی سے متعلق جذبات و احساسات کو پیش کرنے میں موثر ثابت ہوا۔

پانچواں باب ڈرامہ سے متعلق ہے۔موضوع کی مناسبت سے اس باب میں صرف انہیں ڈراموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو سیاسی موضوعات پر تھے اور کسی بھی حوالے ان میں سے تحریکِ آزادی کی جھلک نظر آتی ہیں یا اس سے وابستگی اور اسے فروغ دینے کی کوششوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت، نانا صاحب، اُمراؤ علی کا ڈرامہ 'البرٹ بل''، مولانا ظفر علی خاں کا ڈرامہ ''جنگ روس و جاپان''۔اصغر علی نظامی کا ڈرامہ ''قومی دلبر''۔عبداللطیف شاہ کا ڈرامہ ''ہمارا گھر''۔محشر انبالوی کا ڈرامہ ''غریب ہندوستان''۔ ریاض دہلوی کا ڈرامہ ''مسلم پجاری''۔نیّر انبالوی کا ''وطن''۔دل لکھنوی کا ''تاج محل'' اور شہید وطن، شمس لکھنوی کے ڈرامے ''مادرِ وطن'' اور ''حبُّ الوطن''۔محمد دین تاثیر کا ڈرامہ ''لیلائے وطن'' ۔عاجز ناگپوری کا ''پیامِ حق''۔محی الدین عزم کا ڈرامہ ''دیس کی پکار''۔اظہر دہلوی کا ڈرامہ

''بیداری''۔محمد مجیب کا ڈرامہ ''آزمائش'' شامل ہیں۔

باب ششم میں طنز ومزاح کے تعلق سے تحریکِ آزادی کے تخلیقی اظہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ طنز و مزاح کے پس منظر اور آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی سجاد حسین کے مضامین اور سیاسی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ نیز ''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں کی تخلیقات اور دیگر تحریروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں بعض ایسے مضامین سے بحث کی گئی ہے جن میں مزاح کے پیرائے میں حکومت برطانیہ کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔اس ضمن میں سجّاد حسین کے چند طنزیہ ومزاحیہ خطوط زیرِ بحث آئے ہیں جو انہوں نے اس دور کے سیاسی تناظر میں حکام کو تحریر کئے تھے۔

''اودھ پنچ'' کے بعد آزادیِ ہند تک جن طنز ومزاح نگاروں نے تحریک آزادی سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے اس نوع کی تحریروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ہفتم میں خودنوشت سوانح اور سوانح عمری میں تحریکِ آزادی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصّہ خودنوشت سوانح اور دوسرا حصّہ سوانح عمریوں پر مشتمل ہے۔اس باب میں صرف انہیں سوانح عمریوں اور حودنوشت سوانح کا جائزہ لیا گیا ہے جو سیاسی نوعیت کی ہیں اور جن سے بالواسطہ یا براہ راست تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤ پر روشنی پڑتی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اس باب میں جن خودنوشت سوانح عمریوں کو شامل کیا گیا ان میں جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب''، ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر''، سید رضا علی کی ''اعمال نامہ'' افضل حق چودھری کی ''میرا افسانہ''، نواب احمد سعید خاں چھتاری کی ''یادِ ایّام''، عبدالمجید سالک کی ''سرگذشت''، عبداللطیف بٹالوی کی ''لطیف کی کہانی''، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چند اہم سوانح عمریوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور بعض کی صرف نشاندہی کرادی گئی ہے۔

باب ہشتم اردو صحافت پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے آزادیِ ہند تک ان سبھی

اخبارات اور رسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے جن کا مطمح نظر خالصتاً سیاسی تھا۔ یہ باب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا باب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کی صحافت کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصّے میں بیسویں صدی کے اوائل سے حصولِ آزادیِ ہند کے عرصہ کو محیط ہے اس دوران میں شایع ہونے والے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان سبھی اخبارات اور رسائل کے مُدیروں نے براہ راست برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف لکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام میں آزادی کا جذبہ اور قومی شعور پیدا کیا۔ اور اس طرح آزادی کے مختلف تحریکات کو عوام تک پہنچانے میں ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ان اردو رسائل و اخبارت کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ان کے مدیر سخت سزائیں سہنے کے باوجود آخر تک اپنے وطن عزیز کی خاطر بیباک اور نڈر ہوکر لکھتے رہے۔

اس وسیع موضوع پر بکھرے اور پھیلے ہوئے کام کو ایک مقالے میں جس کی بہر حال کچھ حدود ہوتی ہیں سمیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی خاکسار نے کوشش کی ہے کہ موضوع کے متعلق تمام ضروری مواد اور مطالعے کی مختلف جہات کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

نیشنل آرکالیوز آف انڈیا نئی دہلی، ہردیال میونسپل لائبریری دہلی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، وغیرہ شامل ہیں، ان لائبریریوں کے کارکنان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

شعبہ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تحریک آزادیِ ہند

کا

تاریخی پس منظر

تحریک آزادی ہند کا تاریخی پس منظر

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی حد فاصل تسلیم کی جاتی ہے جہاں ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز۔ آزادی کی یہ جنگ کسی فوری منصوبے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی تیاریوں کا سلسلہ ''جنگِ پلاسی'' اور میسور کی جنگوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چربی والے کارتوس اس جنگ کے آغاز کا بہانہ بن گئے اور ۱۸۵۷ء میں اس نے شِدّت اختیار کر لی۔ تحریک آزادیِ ہند کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کا ذکر بھی ناگزیر ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خشتِ اوّل رکھی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل انگلستان میں یکم دسمبر ۱۶۰۰ء کو ہوئی تھی۔ لندن کے چند انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ اس کمپنی کو ملکہ ایلزبیتھ کے ایک چارٹر کی رو سے ہندوستان میں پندرہ سال کے لئے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ فرمان ایلزبیتھ چارٹر ELIZABETH CHARTER کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملکہ ایلیز بیتھ کے بعد جیمس اوّل انگلستان میں تخت نشین ہوا اس نے بھی کمپنی کے امور اور مسائل میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۶۰۹ء کو جیمس اوّل کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مشرقی تجارت میں ''دوامی اجارہ داری Permanent Settlement کے حقوق مل گئے۔ اس فرمان کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ انگلستان کا کوئی بھی تاجر مشرقی ممالک کے ساتھ ذاتی طور پر تجارتی تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۶۱۵ء میں جیمس اوّل نے سر طامس رو کو اپنا سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔ سر طامس رو جب ہندوستان آیا وہ جہانگیر کا عہد تھا۔ لوگ آسودہ حال تھے۔ انگریزی سفیر سر طامس رو نے مغل دربار تک رسائی حاصل کی اور شہنشاہ سے اچھے مراسم قائم کر لئے۔ اس طرح کمپنی کو دربارِ جہانگیری سے ہندوستان میں تجارت کرنے

کی اجازت مل گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ انہوں نے اپنی تجارت کے استحکام کے فروغ کے لئے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس فیکٹری کے چاروں جانب فصیل بنوائی۔ جہانگیر کے عہد میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد، بہرائچ میں بھی انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔ جیمس اوّل کے بعد چارلس اوّل انگلستان میں تخت نشین ہوا۔ چارلس اوّل کے عہد میں انگلستان کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چارلس اوّل کے قتل کے بعد گرامویل انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے دورِ حکومت میں صنعتی اعتبار سے انگلستان کو فروغ ملا۔ گرامویل کے بعد جلد ہی چارلس اوّل کا بیٹا چارلس دوم انگلستان کے تخت پر متمکّن ہوا۔ اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں سے جائز و ناجائز ہر طرح سے روپیہ بٹورنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستانیوں پر طرح طرح سے زیادتیاں بھی کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ان زیادتیوں کا سدّ باب کیا اور متعلقہ افراد کو سزائیں دیں۔ کمپنی نے عالمگیر سے اپنے افعال کی معافی چاہی اور مصالحت کر لی۔ لہذا اورنگ زیب کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ''تلاشِ ہند'' میں لکھا ہے:

''ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بڑا مقصد جس کے لئے وہ قائم ہوئی تھی یہ قرار پایا تھا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں خصوصاً یہاں کا کپڑا وغیرہ اور مختلف قسم کے مسالے مشرق سے لے جائے جہاں ان کی بے حد مانگ اور کھپت تھی''۔ [۱]

انگریز ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے انہوں نے اپنے مقبوضات کو بڑھانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ سیاسی امور میں دخیل ہونے لگے۔ ہندوستانی تجارت پر انگریز اور ولندیزی (DUTCH) قابض تھے۔ ادھر فرانسیسی بھی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے لگے۔ انہوں نے بہت جلد پانڈیچری، چندرنگر، ماہی، کاریگلا ور چند دیگر بندرگاہوں پر کوٹھیاں قائم کرلیں۔

[۱] جواہر لال نہرو ''تلاش ہند'' جلد دوم (اشاعت اوّل ۱۹۴۶ء ص ۲۸

باری علیگ اپنی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' میں لکھتے ہیں:

''اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تو دوسری جنگوں کے علاوہ ہندوستان میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے۔ ان لڑائیوں کا آغاز کرناٹک میں ہوا۔ تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں اس لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ ان لڑائیوں نے جہاں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دیا وہاں ان لڑائیوں نے انگریزوں کے لئے مشرق میں ملک گیری کے دروازے کھول دیئے''۔ [۱]

پنڈت جواہر لال نہرو ''تلاش ہند'' میں انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام کا اجمالی خاکہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''سترھویں صدی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغل شہنشاہ کی طرف سے سورت میں تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت مل گئی اور چند سال بعد انھوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس کی بنیاد ڈالی گئی ۱۶۶۳ء میں جزیرۂ بمبئی چارلس دوم کو پرتگالیوں کی طرف سے بطور جہیز ملا تھا اور اس نے اس کمپنی کے نام منتقل کر دیا۔ ۱۶۹۰ء میں شہر کلکتہ کی بنیاد رکھی اس طرح سترھویں صدی کے آخر تک برطانیہ نے ہندوستان میں کئی جگہ ساحل بحر پر قدم جمالئے اور آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھے، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں ایک وسیع رقبۂ زمین پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ آیا اور چند ہی سال میں بنگال، بہار، اُڑیسہ اور مغربی بنگال پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ پھر ایک بہت بڑا قدم تقریباً چالیس برس بعد انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا گیا اور وہ دہلی تک جا پہنچے۔ تیسرا اہم قدم ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی آخری شکست کے بعد ہوا اور چوتھا قدم ۱۸۴۹ء میں جب سکّھوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور برطانوی ہند کا نقشہ مکمل ہوگیا''۔

[۱] باری علیگ ''کمپنی کی حکومت'' (طبع چہارم ۱۹۶۹ء) ص ۷۳

[۲] جواہر لال نہرو ''تلاش ہند'' جلد دوم اشاعت اوّل ۱۹۴۶ء ص ۲۴-۲۳

جنگ پلاسی

بنگال کے نواب علی وردی خاں نے اپنے بعد اپنے نواسے سراج الدولہ کو بنگال کا نواب مقرر کیا تھا۔ علی وردی خاں انگریزوں کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھا اور انگریزوں کی حکمت عملی کو سمجھتا تھا۔ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی، مرنے سے قبل اس نے اپنے جانشین سراج الدولہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی:

''مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہے اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس اندیشہ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا، اس کام کی تکمیل تیرے ذمہ ہے''۔

''میرے چراغ! دکن میں ان کی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو، ذاتی جنگوں میں الجھ کر انہوں نے اکبر اعظم کی رعایا کے اموال واملاک پر قبضہ جما لیا ہے۔ ایک وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت کو توڑنا..... سنو بیٹا! انہیں سپاہی رکھنے اور قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں''۔ [۱]

۱۹/اپریل ۱۷۵۶ء کو علی وردی خان کی وفات کے بعد سراج الدولہ بنگال کا نواب ہوا تو انگریزوں نے اس کی مخالفت کی اور رسم کے مطابق نذر نہیں پیش کی۔ انگریزوں کے اس رویّے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز سراج الدولہ کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ نواب کے خلاف فریب کاریوں اور ریشہ دوانیوں کے جال پھیلانے میں منہمک ہو گئے۔ انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ کی مرمت کرانی شروع کر دی۔ مزید برآں نواب کے مخالفین کرشن داس وغیرہ کو اپنے ہاں پناہ دی۔ کرشن داس ڈھاکہ کے دیوان راجہ بلب کا بیٹا تھا۔ جو انگریزوں کا معاون تھا۔ ان حالات نے سراج الدولہ کو انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیا اور اس نے فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا مصمّم عزم کر لیا۔

[۱] باری علیگ ''کمپنی کی حکومت'' جلد چہارم ۱۹۶۹ء ص ۱۰۳

چنانچہ ایک انگریز مورخ ہِل اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ حق بجانب تھا''۔

زین لانے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

''انگریزوں نے دربار سراج الدولہ سے تمام تعلقات منقطع کر لئے ہیں، بارہا انہوں نے سراج الدولہ کو قاسم بازار کی فیکٹری میں جانے سے روکا''۔[۱]

کلائیو اور سراج الدولہ کی فوجیں ۲۱/جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں اتر آئیں۔ ۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو زبردست معرکہ ہوا جس میں اپنے ہی کچھ جرنیلوں کی غدّاری کی بدولت سراج الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور بالآخر جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میر جعفر، درلب عام، جگت سنگھ اور یار لطف خان وغیرہ نے کلائیو سے مل کر نواب کے ساتھ غدّاری کی لیکن میر میدان اور موہن لال نے انگریزوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ میر میدان زخمی ہو کر گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ میر میدان کی موت سے نواب دل شکستہ ہو گیا۔ ادھر میر جعفر کے پیہم اصرار پر سراج الدولہ نے موہن لال کو بھی میدان سے واپس بلا لیا۔ نواب کی فوج منتشر ہو گئی اور اس طرح فوج میں تباہی مچ گئی۔ جنگ کے بعد سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ میر جعفر کی حراست میں رہا۔ رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔ سراج الدولہ کی شہادت پر رام نرائن موزوں نے اس سے اپنے تعلق خاطر کو اس شعر کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

پلاسی کے اس فیصلہ کن جنگ نے انگریزوں کے ہندوستان میں پیر جما دیئے۔ اس جنگ میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے اور وہ پلاسی کے میدان میں اس تاریخی جنگ کی یاد تازہ کرتے رہے۔ ہندوستان کے غیّور فرزندوں

[۱] باری علیگ ''کمپنی کی حکومت'' جلد چہارم ۱۹۶۹ء ص ۱۰۳

کے دلوں میں اپنے ملک کی محبّت کا جذبہ بیدار رہا۔ جنگ کے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں وہ یہ کہہ کر میدان میں اتر آئے ''آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے''۔ جنگ پلاسی میں ہندوستان کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کلائیو نے اپنی سازشوں سے نواب کے خاص سپہ سالاروں میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ کلائیو اپنی زبان پر قائم نہ رہا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ کمپنی کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے کیا۔

انگریز اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گئے اور سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا۔ سراج الدولہ کے قتل کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حیدر علی انگریزوں کے خلاف آخر تک لڑتا رہا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ وہ ایک ذی شعور، جری، شجاع اور دانشمند حکمراں تھا، اس نے کہا تھا: ''ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے''۔

''تاریخ سلطنت خداداد'' کا مصنف محمود بنگلوری نے لکھا ہے کہ:

''وہ (ٹیپو سلطان) انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ سلطان نے ہندوستانیوں کو ایک مرکز پر لانے کی کافی جدوجہد کی۔ اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی مخالف ہو گئی۔ وہ تمام عمر انگریزوں سے جنگ کرتا رہا''۔ [۱]

سر جان ایلس شروتھر جو اس وقت کلکتہ کا چیف جسٹس تھا ٹیپو سلطان کی موت پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ٹیپو کی طاقت ہی ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا (انگریزوں کا) قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا''۔ [۲]

ٹیپو سلطان نے اپنے ملک کی خاطر جان دے دی اور انگریزوں سے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ آخر تک لڑتا رہا اور لڑتے لڑتے جاں بحق ہو گیا۔

[۱] محمود بنگلوری ''تاریخ سلطنت خداداد'' اشاعتِ اوّل ۱۹۷۰ء ص ۱۵

[۲] محمود بنگلوری ''تاریخ سلطنت خداداد'' اشاعتِ اوّل ۱۹۷۰ء ص ۱۷

انقلاب ۱۸۵۷ء اسباب وعلل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مورخین اور اُدباء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ انگریز مورخین نے اس جنگ کو غدر، بغاوت اور فوجی شورش کے نام سے موسوم کیا ہے وہ اسے جنگِ آزادی کی پہلی جنگ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ غدر تھی نہ بغاوت اور نہ فوجی شورش۔ صحیح معنوں میں یہ تحریک تھی جس کو ہندوستان کے حُرّیت پسند عوام نے انگریز عملداری کے جبر وتشدد اور جور وستم سے تنگ آ کر انگریز سامراج کے خلاف لڑی تھی۔ کوئی بھی غیر جانبدار مورخ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس جنگ کا مقصد محض ملک کی آزادی اور اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت تھا اس کے برعکس انگریزوں کا مقصد ملک وقوم پر اپنا تسلّط جمانا، ہندوستان کے عوام پر ظلم کرنا اور آمرانہ نظام قائم رکھنا تھا۔

انگریز حکام کے مسلسل مظالم سے ہندوستانیوں کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور مسلسل تکالیف، مصائب اور لوٹ کھسوٹ سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر، فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

۱۸۵۶ء تک لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل رہا۔ اس نے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کر کے ہندوستان میں کمپنی کی بنیادوں کو استوار کیا۔ باری علیگ اپنی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' میں ڈلہوزی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں کمپنی کی فتوحات کو مکمل کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی تسخیر کا جو خاکہ تیار ہوا تھا اس میں ڈلہوزی نے سُرخ رنگ بھر دیا، ہندوستان ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک کمپنی کے قبضے میں آ گیا''۔[۱]

[۱] باری علیگ ''کمپنی کی حکومت''، ص ۳۸۳

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں مستعفی ہوگیا اور اسی سال لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا، ہندوستان آتے وقت لندن میں منعقدہ ایک الوداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کیننگ نے کہا تھا:

''میری خواہش ہے کہ میرا عہدِ حکومت پرامن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی دے گا، اتنا چھوٹا کہ جتنا انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہو جائیگا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائیگا''۔[۱]

کیننگ کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوررس اور دانشمند انسان تھا اس کی پیش گوئی صادق آئی جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں رونما ہوئی۔

وہ کیا اسباب تھے جن سے ہندوستان کے عوام اور دیسی سپاہ کے دلوں میں انگریز سامراج کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی اور وہ بغاوت پر اتر آئے۔ انہیں اجمالاً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

لارڈ ڈلہوزی نے لیپس (LAPSE) کی پالیسی کا نفاذ جس کے تحت سات ریاستوں ستارا، ناگپور، سمبل پور، جھانسی، جیت پورہ، تجورہ اور کرناٹک وغیرہ کو انگریزی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ لیپس کا مطلب یہ تھا کہ جن ہندوستانی راجاؤں نے کمپنی کے ساتھ دوستی کا صلح نامہ کیا تھا ان میں سے کسی کے مر جانے کے بعد اگر اس کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تو اس کی ساری ریاست پر انگریزی حکومت کا حق ہو جاتا تھا اور کمپنی اس پر قبضہ کر لیتی تھی۔

لارڈ ڈلہوزی کی اس پالیسی سے ارکانِ ریاست انگریزوں کے خلاف ہو گئے، ان میں احمد اللہ، نانا صاحب، راؤ صاحب، تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں، رانی جھانسی، کنور سنگھ، بہادر شاہ کا رشتہ دار فیروز شاہ وغیرہ شامل تھے۔

بغاوت کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دہلی کے ساتھ انگریز عملداری کا رویّہ اچھا نہیں

[۱] باری علیگ ''کمپنی کی حکومت'' ص ۳۶۸

تھا اور بادشاہ دہلی کے ساتھ مسلسل نامناسب سلوک کیا جاتا تھا۔ بغاوت کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کے ساتھ بھی نامناسب برتاؤ روا رکھا۔ مزید برآں عیسائیوں کے مبلّغ مختلف مقامات پر جاتے اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے۔ اسکولوں میں عیسائی مذہب کے مطابق تعلیم دی جاتی اور بچّوں سے بھی عیسائی مذہب سے متعلق سوالات کئے جاتے جو عیسائی مذہب کے مطابق ان سوالوں کا جواب دیتا اس کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔ انگریزوں کے اس مذہبی مداخلت سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں شکوک پیدا ہو گئے اور انہیں یہ اندیشہ ہو گیا کہ انگریز ان کے مذہب کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

''اسباب بغاوت ہند'' میں سر سیّد احمد خاں رقمطراز ہیں:

''پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کی بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری ناراضگی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا''۔ [۱]

عیسائی مذہب کی تبلیغ صرف عوام تک ہی محدود نہ تھی بلکہ فوج میں بھی اس کی خوب تبلیغ کی گئی۔ کچھ افسر تو محض اسی غرض سے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے کہ ہندوستانی سپاہ کو لالچ دے کر انہیں عیسائیت میں داخل کر لیا جائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستانی فوج رفتہ رفتہ انگریزوں سے متنفر ہونے لگی۔

بنگال کی پیدل فوج کے ایک انگریز کمانڈر نے اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے:

''میں لگاتار اٹھائیس سال سے ہندوستانی سپاہیوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہوں اور غیر عیسائی کی روح کو شیطان سے بچانا میرے لئے فوجی فرض کا ایک جز بن گیا ہے''۔

سر سید احمد خاں ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھتے ہیں: [۲]

[۱] سر سید احمد خاں ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' اگست ۱۹۵۸ء ص ۴۵۔۴۴

[۲] [illegible] ۱۹۵۷ء ص ۴۶

''مداخلت مذہبی میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور نا قابل اور ادنیٰ و اعلیٰ جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی کا یہی ہے''۔ ۱؎

سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں اس بغاوت کا جو سب سے بڑا سبب بتایا ہے وہ یہ ہے کہ مجلس لیجسلیٹو کونسل (Legislative Council) میں ہندوستانیوں کو شریک نہ کیا گیا۔ وہ بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان کے مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جس سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا''۔ ۲؎

راقم الحروف سرسیّد احمد خان کی مذکورہ بالا رائے سے متفق نہیں ہے اور انگریز مورخین بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ گورنمنٹ رعایا کے تمام تر مصائب اور تکلیفوں و پریشانیوں سے بخوبی واقف تھی اور جان بوجھ کر انگریزوں نے ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جس سے ان میں غم و غصّہ پیدا ہو گیا۔ یہ لاوا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں پھٹ پڑا۔

ایک فرانسیسی خاتون نے غدر کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے:

''اکبرآباد اور اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی بغاوت کی خبریں نہ سنی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی ملازموں کی صورت سے نارضامندی کی علامتوں اور بغاوت کے اثرات نمایاں تھے۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرزِ حکومت اور غلبہ سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اپنے خیالات کی پردہ داری نہ کر سکتے تھے''۔ ۳؎

چاروں طرف غدر کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ عوام اور سپاہ متنفر ہو چکی تھیں۔ طرح طرح سے بغاوت کے پروپیگنڈے کئے جا رہے تھے۔ اشتہارات چسپاں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں

۱؎ سرسید احمد خاں ''اسباب بغاوت ہند'' ایڈیشن ۱۹۵۸ء ص ۴۳۔ ۲؎ سرسید احمد خاں ''اسباب بغاوت ہند'' ایڈیشن ۱۹۵۸ء ص ۵۶۔

۳؎ پروفیسر ظفر [illegible] (مترجم) ''غدر کے [illegible]'' [illegible] ۱۹۳۵ء ص ۱۸[illegible]

جدید طرز کے چربی والے کارتوس آئے جو سُور اور گائے کی چربی سے تیار کئے گئے تھے۔

پنڈت سندر لال نے اپنی کتاب ''سن ستّاون'' میں چربی والے کارتوسوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''بیرک پور کے پاس ان کارتوسوں کو بنانے کے لئے ایک کارخانہ کھولا گیا۔ ایک دن دم دم گلے ایک برہمن سپاہی پانی کا لوٹا ہاتھ میں لئے بیرک پور کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مہتر نے آکر پانی پینے کے لئے سپاہی سے لوٹا مانگا۔ سپاہی نے ہندو رواج کے مطابق لوٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہتر نے کہا تم اب جات پات کا گھمنڈ نہ کرو! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بہت جلد تمھیں اپنے دانتوں سے گائے کا گوشت اور سُور کی چربی کاٹنی پڑے گی''۔ ۱

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں ''سرجان کے'' بھی اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چمکتے مسالے کو بنانے میں گائے اور سُور کی چربی کو استعمال کیا گیا تھا''۔ ۲

ہندوستانی سپاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں جن لوگوں نے انکار کیا انہیں سخت سزائیں دی گئیں اور تمام فوج کے سامنے سرِ میدان وردیاں اتار دی گئیں، اور بیڑیاں پہنا کر دس دس سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ دیسی سپاہ غم وغصّہ سے بیتاب تھی لیکن مجبور ولاچار کھڑی تماشا دیکھتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہ نے اپنی بیرک میں آگ لگا دی اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ کرنل فینی باغی سپاہیوں کو ان کے فرائض کا احساس دلانے کے لئے آگے بڑھا تو ایک سنسناتی ہوئے گولی نے کرنل کو ختم کر دیا۔ کرنل فینی پہلا انگریز کرنل تھا جو باغی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد جو انگریز افسر، عورتیں، بوڑھے، بچے دکھائی دیئے انھیں قتل کر دیا۔ دوسرے روز یعنی ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو باغی دلی پہنچے، اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر

۱ پنڈت سندرلال ''سن ستاون'' اشاعت ۱۹۵۷ء ص ۶۲-۶۱

۲ باری علیگ ''کمپنی کی حکومت'' ص ۳۸۶

ہوئے ،سلامی دی اور عرض کیا:

''خصور! انگریز عملداری کے نامناسب برتاؤ اور زیادتیوں سے تنگ آ کر اور جب حکومت نے ہمارے دھرم میں مداخلت کی اور چکنی چربی والے کارتوس کو استعمال کرنے پر مجبور کیا تو ہم نے یہ سب کیا۔ باغی کہتے تھے، اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی''۔[۱]

جب باغی سپاہی بہادر شاہ ظفر کے پاس کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے باغیوں کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ کشت وخونریزی کے حق میں نہیں تھے، اور باغیوں سے کہا کہ میں نے ریزیڈنٹ صاحب کو بلوایا ہے اس سلسلے میں ان سے گفت وشنید کروں گا۔ ریزیڈنٹ صاحب کے آنے پر گفتگو کے دوران ایک باغی نے گولی چلادی۔ ریزیڈنٹ بال بال بچا۔ اس کے بعد سپاہیوں کے قتل وغارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستان کے مختلف اطراف میں پھیل گئے اور پورے ملک میں انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہو گئے۔

جنگ آزادی کے جانبازوں میں جرنل بخت خان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے بخت خاں کی قیادت میں بریلی، شاہجہاں پور، مرادآباد، اور بدایوں سے باغی فوج ہتھیاروں سے مسلح دہلی پہنچی، اس کے بعد بغاوت ملک گیر پیمانے پر شروع ہوگئی۔ بخت خان نے ملک گیر سطح پر باغی فوج کی قیادت کی اور وہ آخر تک لڑتا رہا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد بخت خان غائب ہو گیا اور آج تک اس کا سُراغ نہ مل سکا۔

ملک گیر سطح پر رونما ہونے والی بغاوت کسی مخصوص طبقے یا فرقے کی جنگ نہیں تھی اور یہ کسی منصوبے کے تحت بھی نہیں لڑی گئی تھی بلکہ یہ لاوا تو جنگ پلاسی سے پک رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء میں اچانک پھوٹ پڑا، ملک گیر پیمانے پر پھیلنے والی اس تحریک میں ہندو مسلمان اور سکھوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر اپنے وطن کی آزادی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کے لئے جنگ کی تھی۔

[۱] سرسید احمد خاں ''اسباب بغاوت ہند'' ص ۴۵

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی وجوہ

ملک گیر سطح پر اس بغاوت کی تاریخ ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء طے پائی تھی۔ اسی اثناء میں چربی والے کارتوس آئے اور ہندوستانی فوج کو انہیں استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ہندوستانی فوج نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو انہیں سخت سزائیں دیں۔ میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہوسکا اور ۱۰ رمئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلادی۔ جو منصوبہ بغاوت کو شروع کرنے کا ہندوستانیوں نے تیار کیا تھا اس سے قبل ہی جنگ کا آغاز کر دیا گیا، اگر جنگ کا آغاز طے شدہ تاریخ یعنی ۳۱ رمئی کو بیک وقت پورے ہندوستان میں ہوا ہوتا تو انگریز حکمرانوں کا ہندوستان پر قبضہ آسان نہ ہوتا۔

اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، ناکامی کی بعض اہم وجوہ تھیں۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقے اور والیان ریاست نے اس تحریک میں حصّہ نہیں لیا۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے برطانوی حکومت کی مدد کی۔ زمیندار طبقے کو اس بات کا خدشہ تھا کہ جو جاگیریں انگریزوں سے انہیں ملی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگیریں ان سے چھن جائیں۔

ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانی کسی ایسے مرکزی لیڈر کا انتخاب نہ کر سکے جو پوری تحریک کی مجموعی قیادت کرتا اور مختلف علاقوں اور طبقوں کے افراد کو متحد کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا۔ ہندوستانیوں کے پاس جدید ہتھیار بھی نہیں تھے۔ سائنس اور تکنالوجی کی بھی کمی تھی۔ وہ کسی طرح منظّم بھی نہیں تھے اس لئے وہ باقاعدہ محاذ بنا کر نہیں لڑ سکے انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نظام بند کر دیا، ہندوستانیوں کو اس سلسلے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کو گوالیار کے شنکر راؤ، حیدرآباد کے سالار جنگ، نیپال کے جنگ بہادر، مان بہادر سنگھ اور سکھوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔

اس کے برعکس انگریز منظّم طریقے سے جنگ کی سرکاری عملے اور جدید ہتھیاروں کا بھی

استعمال کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی رہنماؤں کی ناکامی اور شکست کی وجوہ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بغاوت کے سربراہوں میں کبھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے برخلاف انگریز اپنی ملکہ کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑ رہے تھے''۔[۱]

ہندوستانی جانبازوں میں رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی)، روہیل کھنڈ کا بخت خان، اَودھ کی بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے احمد شاہ، خان بہادر، کنور سنگھ وغیرہ ایسے قابلِ فخر لوگ تھے جو برطانوی سپاہ اور کمانڈروں سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن ان کی طاقت منتشر تھی۔ ان کا کوئی مرکزی محاذ نہیں تھا جہاں سے ان کی فوجوں کی تنظیم ہوتی اور مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار ہوتے ان میں آپسی تال میل ہوتا۔ یہ جانباز منظّم ہو کر مشترکہ کمان کے تحت لڑنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر ہندوستان کے مختلف اطراف میں بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک نتائج اور اثرات

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا باب ہے جو خونی واقعات سے لبریز نظر آتا ہے اس قیامت صغریٰ کے حالات و کوائف بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بغاوت ناکام ہو گئی۔ بغاوت کے فرد ہونے کے بعد انگریزوں کے سفّاکانہ انتقام اور قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو گیا مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ان کی صنعت و حرفت تباہ کر دی گئی۔ انہیں طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں ان کے دین و ایمان کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریزوں کے مسلسل مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آ کر جب ہندوستانیوں نے نجات پانی چاہی تو انہیں سختی سے کچلا گیا اور انگریزوں نے انہیں ایسی عبرت ناک سزائیں دیں کہ وہ چنگیز

[۱] آجکل ''آزادی نمبر'' اگست ۱۹۵۷ء ص ۴۔۵

خاں سے بازی لے گئے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ۱۸۵۷ء کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ'' میں لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی جو رنگ و نسل، مذہب و ملّت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی۔ یہاں پہنچکر دم توڑ دیتی ہے۔ اور اسکے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانے سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی کو توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل دیتی ہیں''۔[۱]

جب ہم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں انگریزوں کے مظالم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہندوستانیوں کو شارع عام پر پھانسیاں دی گئیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو سخت ترین سزائیں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

خلیق نظامی رقمطراز ہیں:

''لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اس قسم کی موت کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایک روز توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر

[۱] خلیق احمد نظامی ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ'' اشاعت ۱۹۵۸ء ص ۳

ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جن کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہوکر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے''۔ ۱؎

دہلی میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''سب سے زیادہ عبرتناک دہلی کی تباہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی ہنگامی تحریک کا ہی مرکز نہ تھی بلکہ ایک تمدن کی آخری نشانی تھی۔ وہاں کی ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی تھی۔انگریزوں نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ چوک سعداللہ خاں، اردو بامار، خانم بازار، پلاتی بیگم کا کوچہ، دیا گنج کی گھاٹی، کلیوں کا بازار، پنجابی کڑا، دھوبی کڑا، رام گنج، سعادت خاں کا کڑا، رام جی داس کا گودام والے کے مکان کے علاوہ شاہی درسگاہ، دارالبقا، اکبرآبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد، چوبی مسجد کو اس طرح مسمار کیا کہ نام ونشان تک باقی نہ چھوڑا''۔ ۲؎

مسلمانوں کی سزا کے لئے جو عبرتناک طریقہ انگریزوں نے اختیار کیا تھا وہ سیخیں گرم کر کے باغیوں کو داغتے تھے۔اس کے تصوّر سے بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمان براہِ راست طور پر متاثر ہوئے اور کثرت کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کا نشانہ بنے کیونکہ مسلمانوں کا اس تحریک میں اہم کردار تھا۔

انگریزوں کے سفاکانہ انتقام کا ذکر کرتے ہوئے خلیق نظامی لکھتے ہیں:

''ہزاروں مسلمان معمولی معمولی شبہات پر تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ہزاروں مسلمان گھرانے نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سینکڑوں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں دردر مارے پھرنے لگے''۔ ۳؎

پنڈت سندرلال ''رسل'' کے حوالے سے مسلمانوں پر مظالم کے بارے میں لکھا ہے:

''مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انھیں سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا۔ان پر سُور کی

۱؎ خلیق احمد نظامی ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص۱۴۔ ۲۔ خلیق احمد نظامی ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص۹
۳؎ خلیق احمد نظامی ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص۵۸

چربی مل دی جاتی تھی اور پھران کے جسم جلا دیئے جاتے تھے''۔ ۱

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ اپنی کتاب ''ہندوستان میں اکتالیس سال'' میں غدر کے دلدوز واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''۱۸۵۷ء کے غدر میں ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو پھانسی دی گئی اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے ان کا کوئی شمار نہیں''۔

غرض یہ کہ مسلمان مرد، عوت، بوڑھوں اور بچّوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ غدر کے بعد جب مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ کیا گیا تو پہلے کی بہ نسبت ایک چوتھائی آبادی بھی باقی نہ رہی تھی۔ بغاوت کے اہم مراکز میں میرٹھ، دہلی، لکھنؤ اور روہیلکھنڈ کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں، ان کے علاوہ بجنور، مرادآباد اور امروہہ وغیرہ کے حریت پسندوں نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصّہ لیا۔ دہلی میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان انگریزوں کے تشدد کا نشانہ بنے۔ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی ایک انگریز افسر کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم نے اس قسم کی سینکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوؤں میں لاشوں کے سبب جگہ نہ ہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں یا بیٹھی تھیں جس وقت ہم نے انھیں نکالنا چاہا تو وہ چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ، اور گولی سے مارڈالو، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں۔ ہماری آبرو خراب نہ کرو اور جب ہم ان کو باہر نکالتے تو وہ ڈر کے مارے تھرتھر کانپنے لگتیں اور بعض ان میں بیہوش ہوکر گر پڑتی تھیں''۔ ۲

انگریز مؤرخین خود بھی ان مظالم کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی تواریخ میں بھی یہ واقعات جہاں تہاں مل جاتے ہیں۔

مولانا سیّد احمد علوی، اسپنسر والیول کے حوالے سے دہلی کی قتل و غارتگری کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱ بحوالہ سندرلال ص ۱۹۵

۲ خواجہ حسن نظامی ''دہلی کی جانکنی'' اشاعت دوم ۱۹۲۵ء ص ۶۲-۶۱

''وحشی نادرشاہ نے بھی وہ لوٹ نہ مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارعِ عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا''۔ [۱]

دہلی دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آ گئی اور انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ شروع ہو گیا بخت خاں (جو باغی سپاہیوں کا لیڈر تھا) نے بہادر شاہ ظفر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا لیکن مرزا الٰہی بخش جو میجر ہڈسن کا مخبر تھا اس نے بیگم زینت محل اور بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ ادھر مرزا الٰہی بخش نے ہڈسن کو اطلاع کر دی ہڈسن نے فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کا محاصرہ کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر، زینت محل اور نوعمر شہزادے جواں بخت کو گرفتار کر لیا گیا۔ جنرل بخت خان اپنی فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں واقع سرنگ کے ذریعہ غائب ہو گیا اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

دہلی کو فتح کرنے کے بعد انگریز ملک کے مختلف اطراف میں پھیل گئے اور انتقام لینے شروع کر دیئے۔

''فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا اور قتل و غارت گری کا ہنگامہ برپا کیا جس کی مثال انیسویں صدی کی تاریخ میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان اس ظلم و بربریت کا شکار ہو گئے''۔ [۲]

دہلی کے بعد جو شہر انگریزوں کی بربریت کا سب سے زیادہ نشانہ بنا وہ لکھنؤ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ شہر بھی فرنگیوں کی تباہ و بربادی سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ ''تاریخ لکھنؤ'' کا مصنف لکھنؤ کی تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

''مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد شہر لکھنؤ تقریباً پندرہ دن تک لٹتا رہا۔ ہزاروں بے

[۱] سید احمد علوی ''افسانہ غم'' ص ۲۸۔۲۹

[۲] خلیق انجم نظامی ''۱۸۵۷ء کا تاریخی پس منظر'' ص ۵۱

روز گار قتل کر دیئے گئے۔ سینکڑوں باعصمت خواتین نے حفظ ناموس کی خاطر خودکشی کر لی۔ دولت مندنان شبینہ کو فاصلہ رکھیئے محتاج ہو گئے مگر سامراج کا غیظ وغضب اس پر بھی کم نہ ہوا اور یہ حکم ہوا کہ جہاں جہاں باغیوں نے قیام کیا ہو اور جہاں کے باشندوں نے ان کی مدد کی ہو ان سب محلّوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے۔ چنانچہ دریائے گومتی کے کنارے جتنے بھی مکانات تھے یا تو نذرِ آتش کر دیئے گئے یا بارود لگا کر اڑا دیئے گئے۔ شہر کے کتنے محلّے اور بازار تھے جن کا آج نام و نشان تک نہیں''۔ ۱ے

مذکورہ حوالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے حریت پسندوں پر مظالم ڈھانے میں کوئی کمی اٹھا کر نہیں رکھی۔ مصنف ''آکسفورڈ تاریخ ہند'' اپنی مخصوص زبان میں اس منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خوفناک حوادث بے انتہا مصائب اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے جن کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہنچتا ہے''۔ ۲ے

انقلاب مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس عظیم شکست سے ہندوستانیوں نے کچھ تجربات بھی حاصل کئے جس سے مستقبل میں وہ قومی تحریک کی اساس کو استوار کرنے کے لائق ہو گئے اور اس طرح ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔

۱ے امجد علی خاں ''مختصر تاریخ اودھ'' اشاعت اوّل ۱۹۷۸ء ص ۲۰۹

۲ے شیخ [illegible] (مترجم) ''انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ'' اشاعت دوم [illegible]

تحریکِ آزادی کا سفر

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے آزادیِ ہند تک

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے منتقل ہوکر براہِ راست حکومتِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آ گئی۔ ادھر انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمان بالخصوص انگریزوں کے مظالم کا شکار بنے۔ ہندوستانیوں نے بھی اپنے ملک کو آزاد کرانے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ایک طرف سیاسی سطح پر عوام کا استحصال، دوسری جانب اس جبر و تشدد اور استبداد کے خلاف عوام کے دلوں میں سلگتی ہوئی غم وغصّہ کی آگ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور حکومت کے مابین کشیدگی روز بروز بڑھتی رہی۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر انگریزوں کو ایک ایسی انجمن بنانے کی فکر ہوئی جس سے عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قایم ہو سکے اور حکومت کے خلاف عوام کے دلوں میں پنپتی ہوئی مخالفت کا مناسب طریقے سے سدِّ باب کیا جاسکے لہٰذا ایک ریٹائرڈ افسر اے.او.ہیوم نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی تجویز وایما پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا خیال تو پہلے ہی چند سر برآوردہ انگریزوں کے ذہنوں میں آیا تھا لیکن اس کی باضابطہ طور پر تشکیل ۱۸۸۵ء میں عمل میں آئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں ڈبلوسی بینرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے بہتّر نمائندوں نے شرکت کی۔

تواریخ کانگریس کا مصنف انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس کے بارے میں لکھتا ہے:

''انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس تو قراردادوں کے باعث قابلِ ذکر ہے جنہیں ہندوستان کے قومی مطالبات کی ابتدا کہا جاسکتا ہے''۔ [1]

کانگریس کس نہج پر قائم کی گئی اور اس کا مزاج کیا تھا اس سلسلے میں سرجان کنگ لکھتا ہے:

[1] پتاجی سیتارامیہ ''تواریخ کانگریس'' بجازی پریس لاہور ص ۲۸

''کانگریس کی تشکیل مغربی تخیل اور مغربی نمونے کے مطابق ہوئی۔اس کا تمام نظام اور اس کی رُوح مغربی ہے۔اور جن اغراض ومقاصد کا اس میں اعلان کیا ہے وہ بھی مغربی سیاسیات ہی سے ماخوذ ہے''۔[۱]

لارڈ ڈفرن نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی غرض و غایت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''حاکم اور محکوم دونوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہندوستان کے سیاستداں اصحاب سالانہ جمع ہو کر حکومت کو بتائیں کہ اس نظام میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح رفع کیا جا سکتا ہے''۔[۲]

انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ کے مطالعے سے ذہن میں یہ سوال اُبھرتے ہیں کہ اس انجمن کے قیام کا خیال ایک انگریز کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ ایک غیر ملکی کو ہندوستانیوں کے مسائل سے کیا دلچسپی تھی؟ ہیوم اس انجمن کی ترویج وترقی میں اتنی دلچسپی اور انہاک سے کیوں حصّہ لے رہا تھا اور کانگریس کے اغراض ومقاصد کو عوام تک پہنچنے کے لئے ہندوستان کے شہروں کا دورہ کر رہا تھا؟ اور لارڈ ڈفرن ہندوستان کے سیاستداں اصحاب کو ایک پلیٹ فارم پر کیوں جمع کرنا چاہتا تھا؟

انڈین نیشنل کانگریس نہ قومی جذبہ کے تحت قائم ہوئی تھی اور نہ اسے عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی تھی۔ابتدا میں اس انجمن کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں پھیلی ہوئی بیچینی اور ان کے باغیانہ جذبات کو سمجھا جا سکے اور کانگریس کے اجلاسوں میں انگریز ہندوستانیوں کے باغیانہ خیالات اور منصوبوں سے باخبر ہو جائیں۔انڈین نیشنل کانگریس کے توسط سے اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں اور ہندوستانیوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکیں لیکن انگریزوں کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔آہستہ آہستہ کانگریس نے قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی آخر میں یہی انجمن ہندوستان میں انگریزوں کے انحطاط کا اور زوال کا باعث بن گئی۔

[۱] سیاسیات ہند (ترجمہ پولیٹکل انڈیا از سر جاں کنگ) جناح برقی پریس ص ۶۵

[۲] ایس اے احمد ''مکمل تاریخ آزاد ہند فوج'' جناح برقی پریس دہلی ص ۶۵

کانگریس کے قیام کے بعد کئی سال تک اس کے اجلاسوں میں صرف ریزولیوشن پاس ہوتے رہے اور گذارشات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ کانگریس کے ہندوستانی رہنماؤں میں جوش اور گرمی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان کی قومی آزادی کی مانگ کی جانے لگی۔ اس دوران کانگریس کے اغراض و مقاصد میں بتدریج تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا مقصد حسبِ ذیل قرار پایا:

''انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد عوام کی کوششوں سے سلف گورنمنٹ کے اس آئین کا حصول ہے جو برطانوی سلطنت کے دوسرے ممبران کو حاصل ہے''۔ ۱

سر آکلینڈ کانگریس کے قیام کو انگریزوں کے مستقبل کے لئے خطرناک تصور کرتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ کانگریس کی تحریک قوم پرستوں اور باغیوں میں نفرت کی خلیج پیدا کردے گی۔ اس نے کانگریس کی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے ایک تقریر کے دوران کہا تھا:

''کانگریس نہایت بے انصافی سے اپنے آپ کو ہندوستانی آبادی کا نمائندہ کہتی ہے''۔ ۲

سر آکلینڈ کے مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دوررس اور دانشور انسان تھا۔ اس کی پیش گوئی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں صادق آئی۔ کیونکہ اس وقت تک کانگریس نے مکمل طور پر قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب یہ انجمن انگریزوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی قومی انجمن بن چکی تھی۔ اور اس کا نصبُ العین یہ قرار پایا تھا:

''انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی کردار نہ صرف وطن کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا بلکہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد سے ذات برادری اُونچ نیچ کی تفریق ختم کر کے غریب امیر کے فرق کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستان حاصل کرنا تھا''۔ ۳

دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء کے موقع پر کانگریس کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپنی

۱ پتا جی سیتا رامیہ ''تواریخ کانگریس'' ص ۱۹ ۲ پتا جی سیتا رامیہ ''تواریخ کانگریس'' ص ۱۱۳

۳ [illegible] ''تحریک آزادی ہند کی جھلک'' اشاعت اوّل ۱۹۸۳ء ص ۱۵

تقریر کے دوران جو کچھ کہا تھا اس تقریر کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

''.....کانگریس ان بے زبان، مفلس اور فاقہ کش لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندوستان کے طول وعرض میں سات لاکھ دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور آیا وہ برطانوی ہندوستان کے باشندے میں یا ریاستوں کے، ان کی حفاظت کو کانگریس ہر طرح پیش نظر رکھے گی۔ اور اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ تصور نہیں ہوگا کہ کانگریس ان بے زباں اور فاقہ مست لوگوں کی خاطر ہر ممکن قربانی کرے گی اس لئے یہ کسانوں اور غریبوں کی جماعت کہی جاسکتی ہے''۔[1]

کانگریس کو مضبوط اور استوار بنانے میں جن عمائدین ملک نے اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے ان میں دادا بھائی نوروجی، آنند چارلو، ڈی۔ای۔واچھا، جی۔کے گوکھلے، بدر الدین طیّب جی، حسن امام، جسٹس کاشی ناتھ، ڈبلیو۔سی۔بینرجی، لوک مانیہ تلک، سریندر ناتھ بینرجی، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سر فیروز مہتہ، آنند موہن بوس، مولوی مظہر الحق، اجودھیا ناتھ، راجہ رام پال سنگھ، کالی چرن بنرجی، نواب سید محمد بہادر، امبیکا چرن موزمدار، بھوپندر ناتھ باسو، پنڈت بشن نارائن دھر، رمیش چندر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اور گاندھی جی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کانگریس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ ۱۹۰۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو اس موقع پر کانگریس میں انتہا پسندی کا ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک کانگریس کی پالیسی معتدل تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا کانگریس کی پالیسی میں تبدیلیاں آتی گئیں ۱۹۱۷ء میں کانگریس میں انتہا پسندوں کا تسلّط ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی افریقہ سے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے آزادی

[1] پتا جی سیتا رامیہ ''تواریخ کانگریس'' ص ۳۶

کی تحریکوں میں باضابطہ حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کی زیرِ صدارت کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا، گزارشات اور عرض داشتوں کی جگہ قومی مطالبات نے لے لی۔ اسی سال کانگریس کا نصب العین ''سوراج'' قرار دیا گیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے مسٹر سی. آر. داس نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا۔ ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا تھا:

''ہمارا نصبت العین سب سے پہلے نیشنلزم ہے۔ ایک ایسا عمل جس کے ذریعے قوم کی ہستی کا اظہار ہوتا ہے اور ہندوستانی قوم کی حقیقی ترقی سوراج کی منزل سے وابستہ ہے، اس لئے ہندوستان کے تمام مسائل کا حل آج سوراج کا حصول ہے''۔ [۱]

تقسیم بنگال

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی عوام کا شعور پورے طور پر بیدار ہو چکا تھی۔ نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ لارڈ کرزن جو ۳۰/ دسمبر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا تھا۔ اس نے ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تقسیم بنگال کی کارروائی کے سبب ہندوستان میں خاصی شورش پیدا ہوگئی اور ہندوستان کے عوام صوبہ بنگال کی تقسیم کے مسئلے پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''۱۹۰۵ء کا سال ایک ناقابل تسکین المیہ کا سال تھا۔ وہ شدید حادثہ بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تھا''۔ [۲]

مُسلم لیگ کا قیام

یہی وہ دور تھا جب ''مسلم لیگ'' کے قیام کا شعور پیدا ہوا۔ اور ''ہندومہا سبھا'' اسی سال

۱ حسین علوی ''کاروانِ آزادی'' ص ۱

۲ تاراچند ''تاریخ تحریک آزادیِ ہند'' [illegible] جلد سوم اشاعت [illegible] ص ۴۴۹

معرض وجود میں آئی۔ ۹ر نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب سلیم اللہ خاں بہادر ڈھاکہ نے ایک تحریر جاری کی جس میں تجویز کیا گیا کہ مسلم انڈیا کنفرنٹینسی Muslim India Confrontancy کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور مجوزہ کاموں کا خاکہ بنا کر بزرگانِ قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور مشوروں کے لئے دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس کے ساتھ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس موقع پر ہندوستان کے تمام مسلم سیاسی رہنماؤں کا اجتماع ہوا۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا قیام عمل میں آیا۔ نواب وقار الملک سکریٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سکریٹری مقرر کئے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد ۱۹۰۷ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر جن سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی ان میں نثار احمد خاں، حسین شہید سہروردی، عبد الرحمٰن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسنین، غازی عبد العزیز، مولانا شوکت علی، سیّد بقاء الحسن، فضل محمد علی خاں، شیخ عبد اللہ، عبد المجید، سیّد نبی اللہ، عبد السّلام رفیقی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی، نواب سر سلیم اللہ خاں، شرف الدین، نواب محسن الملک، سید رفیع الدین احمد، مولانا مظہر علی خاں، خورشید سید جی، عبد الکریم، ظہور احمد، شاہ مصطفےٰ، وزیر حسن، شمشاد احمد خاں، محمد یوسف، چودھری غلام مصطفےٰ، نواب سید نواب علی، محمد علی جسٹس شاہ دین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ ہندوستانیوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی بھرپور اعانت کی اور کمک پہنچائی۔ تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لئے

گئے۔ انہوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری اور وفاداری کے جوہر دکھائے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر وہ ان کے جائز حقوق دیدیں گے۔لیکن ۱۹۱۸ء میں جب جنگ ختم ہوئی تو انگریز اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔مزید برآں ہندوستانیوں پر سخت ترین قوانین نافذ کئے گئے اور شدت کے ساتھ حریت پسندوں کو کچلنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ادھر ۱۹۱۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں ایک ساتھ ہوئے۔

رولٹ ایکٹ

۱۹۱۷ء کے اواخر میں مسٹر جسٹس اے رولٹ کی قیادت میں رولٹ ایکٹ کمیٹی قائم ہو گئی۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ اندرون ملک حکومت کے خلاف ہونے والی ''سازشوں'' کی تحقیقات کرے اور ان کا انسداد بھی۔ اس ضمن میں اپریل ۱۹۱۸ء کو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے تحت ایک رپورٹ پیش کی گئی اور ہندوستانی عوام کی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی۔ رولٹ ایکٹ کا واضح مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عمائدین اور عوام کو گرفتار کیا جائے اور تحریک کو دبا دیا جائے جس سے وہ آگے سر نہ اٹھا سکیں، لیکن اس کا ردّعمل یہ ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور بھی سرگرم ہو گئے۔مسٹر جناح اور گاندھی جی نے اس ایکٹ کی شدت سے مخالفت کی۔

ستیہ گرہ کی تحریک

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ اگر حکومت کا یہی طریقہ رہا تو ہم ستیہ گرہ کی پالیسی اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔لیکن حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ گاندھی جی نے مجبور ہو کر رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ اور ایک

حلف نامے کے تحت یہ کہا کہ:

''ستیہ گرہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رولٹ ایکٹ منظور کرلیا گیا اور اسے قانون کی صورت دیدی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کریگا تاوقتیکہ قوانین واپس نہ لے لئے جائیں''۔ ۱؎

رولٹ ایکٹ کی ہندوستانیوں نے شدت سے مخالفت کی ''جدوجہد آزادی'' کا مصنّف لکھتا ہے:

''جب گاندھی جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو انہوں نے ستیہ گرہ کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریک نہ مقامی تھی اور نہ اس کے مقاصد محدود تھے۔ انہوں نے ایک ستیہ گرہ سبھا قائم کی اور ان ظالمانہ قوانین کی پابندی نہ کرنے کا ایک عہد نامہ تیار کیا۔ ۶/اپریل ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی نوبت آئی تھی۔ ہڑتال کی کامیابی بےمثال تھی''۔ ۲؎

گاندھی جی کی اس مہم کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ملک میں توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ بمبئی، احمد آباد، لاہور میں جہاں تہاں عمارتوں کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، گاندھی جی اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کرلیا گیا۔ ۳/دسمبر کو فیض آباد، (یوپی) میں پولیٹکل کانفرنس کے اجلاس میں پنڈت نہرو نے پچاس ہزار سے زائد کسانوں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہاں:

''انفرادی طور پر بھوک ہڑتال کرنے اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر ستیہ گرہ کرنے کو ہم روا رکھیں گے، ستیہ گرہ کا ہتھیار ضروری قومی مقاصد کے لئے مقصود ہے، میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ مسلم لیگ نے ''ستیہ گرہ'' کے اصولوں کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ تاہم یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ہمیں ملک میں آزادی کی جدوجہد کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ تمہیں آزادی ابھی تک نہیں ملی۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ایک بہادر گڈھوالی پچھلے ساڑے آٹھ سال سے جیل

۱؎ صلاح الدین ناسک ''تحریک آزادی'' پنجاب آرٹ پریس لاہور ص ۳۱۱

[illegible]

میں محبوس ہے اور ابھی تک اسے رہا نہیں کیا گیا''۔[۱]

ہوم رول لیگ

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک ایسی خاتون کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو ہندوستانی نہ ہوتے ہوئے بھی جنگ آزادی میں برابر شریک تھی۔ جس نے ہندوستانی مجاہدین کی آواز میں آواز ملا کر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ اس خاتون کا نام اینی بیسنٹ تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں اینی بیسنٹ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ''نیوانڈیا'' کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا تھا۔ اس خاتون کے دل میں ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں مدارس میں ہوم روم لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ جس میں ہندو، مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اینی بیسنٹ نے انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ اینی بیسنٹ کے اس باغیانہ رویہ کو دیکھ کر ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے انھیں نظر بند کر دیا۔

ڈاکٹر راجندر پرساد اپنی خودنوشت سوانح ''اپنی کہانی'' میں ہوم رول لیگ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کر کے سارے ملک میں بڑی ہلچل مچادی۔ تقریباً سبھی صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ سرکار اس سے گھبرائی تھی تو اس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کو ان کے دو ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کر دیا''۔ [۲]

تحریکِ خلافت

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ تحریکِ آزادی کی تاریخ میں خلافت تحریک نے بڑا اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ خلافت کمیٹی کا قیام جولائی ۱۹۱۹ء کو

[۱] اخبار مدینہ جنوری ۱۹۳۹ء ص ۱۱ جلد ۲۸

[۲] راجندر پرساد ''اپنی کہانی'' (مترجم گوپی ناتھ امن) ص ۲۵۳

عمل میں آیا اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلسہ نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں مختلف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ متعدد سیاسی رہنما جیلوں میں تھے۔ مولانا محمّد علی جوہر جب جیل سے واپس آئے تو انہوں نے ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ تاکہ اس سیاسی تحریک کے ذریعہ انگریزوں کی منتقمانہ اور سفّاکانہ پالیسیوں کو بے نقاب کیا جاسکے۔ مسلمانوں نے تحریک میں دلچسپی سے حصّہ لیا۔ خلافت تحریک کانگریس کا ایک اہم حصّہ بن گئی۔ محمد علی، شوکت علی اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے اثر انگیز تقریریں کیں۔ اس تحریک میں جن سیاسی رہنماؤں نے ایک مؤثر کردار ادا کیا ان میں مولانا ابو الکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، غیاث اللہ فرنگی محلی، مولانا جیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابو القاسم سیف بنارسی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مظہر الحق خاں وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ گاندھی جی نے بھی تحریک خلافت میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے کام کیا تھا۔ قاضی عدیل عباسی ''تحریک خلافت'' میں لکھتے ہیں:

''تحریک خلافت سے ہمارے ملک میں آزادیِ کامل کی بنیاد پڑی، اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پالیا''۔[۱]

حادثہ جلیانوالہ باغ

پہلی جنگ عظیم ختم ہوچکی تھی۔ انگریز یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے عوام اپنے جائز حقوق کی مانگ کریں گے لہذا انگریزوں نے اس کے انسداد کے لیے ''رولٹ ایکٹ'' کے نام سے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اور انہیں

[۱] قاضی عدیل عباسی ''تحریک خلافت'' اشاعت ۱۹۷۸ء ص ۱۹

سخت ترین سزائیں دی گئیں۔اس سلسلے میں ہندوستانی رہنماؤں نے برطانوی سرکار کی سفاکانہ پالیسیوں کے خلاف ۱۲/اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔جلیانوالہ باغ عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک تنگ راستہ تھا جہاں سے ایک مسلح کار بھی نہیں گزر سکتی تھی۔اس احاطہ میں مختلف لوگوں کے اندازے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار لوگ جمع تھے۔لوگ پرامن طریقے سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہے تھے۔جنرل ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازے سے داخل ہوئے۔جنرل ڈائر نے فوراً اپنی فوج کی صفیں باندھ کر باغ کا محاصرہ کرلیا۔ڈائر کے حکم پر انگریز سپاہیوں نے اندھا دند گولیاں چلائیں۔ہزاروں ہندو مسلمان اور سِکھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچّے یتیم ہو گئے۔جنرل ڈائر کے بہیمانہ رویے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ بیدار کر دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے پنجاب سب کمیٹی کے مطابق

''جلیانوالہ باغ کا قتل عام بچوں سمیت بالکل بے قصور اور نہتّے لوگوں پر ایک سوچا سمجھا وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دلی میں لاثانی تھا''۔[1]

اِس حادثہ میں تقریباً دو ہزار ہندوستانی ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے۔جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثے کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی۔یہ رپورٹ سراسر ہندوستانی عوام کے خلاف تھی۔اس رپورٹ سے ہندوستانی عوام میں مزید اشتعال پیدا ہو گیا۔

ترکِ موالات

۲۰/مئی ۱۹۲۰ء کو منعقدہ بنارس کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ترکِ موالات پالیسی اپنائی جائے۔اِس مقصد کی تکمیل کے لئے یکم جون کو مسلمانوں کا ایک جلسہ آلہ آباد میں منعقد ہوا اور ترکِ موالات کی پالیسی کو باضابطہ طور پر منظور کرلیا گیا۔اور تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی کی جانے لگیں۔مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین

1- Report of Punjab sub commission Appointed by the Punjab sub committee of the Indian National Congress

کچلو، حسرت موہانی اور حاجی احمد صدیق جیسے سیاسی رہنماؤں نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصّہ لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ تحریک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس تحریک میں ہندوستانیوں نے بھرپور دلچسپی لی اور انگریزوں سے عدم تعاون کیا۔

تحریک عدم تعاون

۱۹۲۱ء میں کانگریس کا جلسہ احمد آباد میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت کے فرائض سی۔آر۔ داس کو انجام دینے تھے لیکن انگریزوں نے انہیں اجلاس سے قبل ہی گرفتار کر لیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس جلسہ کی صدارت کی اور صدارتی خطبہ دیا:

''عدم تعاون کی روح عام ملک پر طاری ہے اس براعظم کے دور دراز گوشوں میں کوئی بھی دل ایسا نہیں جو سوراج حاصل کرنے اور خلافت و پنجاب کی دست درازیوں کی دادرسی کے لئے ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبے سے لبریز نہ ہو''۔ [۱]

عدم تعاون کی تحریک جولائی ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور سُرعت سے ملک میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اس تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے حسین علوی ''کاروانِ آزادی'' میں لکھتے ہیں:

''عدم تعاون و عدم تشدد محض ہندوستانی تحریک نہیں بلکہ یہ بڑی تیزی سے ایشیائی تحریک بن گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب دنیا والے جھوٹ اور ناانصافیوں کے خلاف اسے عالم گیر ہتھیار کے طور پر اپنا لیں گے۔ تحریک عدم تعاون کی کامیابی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہمارے کارکن بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کر رہے ہیں، اپنے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دن بہ دن زیادہ تعداد میں جیلوں کا رُخ کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ خوبیوں کی بات یہ ہے کہ حکومت کے بے پناہ جبر کے باوجود کہیں بھی جواب میں تشدد پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس جبر نے قومی عزم کو اور پختہ کرنے کا کام کیا ہے۔ جمیعۃ العلماء کے فتوؤں کی ضبطی، مقدمات کراچی، قانون اجلاس باغیانہ،

[۱] حسین علوی ''کاروانِ آزادی'' ص ۵۰۶

کریمنل اور امنڈمنٹ ایکٹ، ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۴ ان سب کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ لوگوں میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور اپنے مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی پختہ ہو گیا''۔ [۱]

عدمِ تعاوٗن کی تحریک میں ملک کے ہر طبقہ کے افراد نے دلچسپی سے حصہ لیا، عدالتوں، اسکولوں، کالجوں اور تمام اداروں سے عدم تعاون کیا گیا۔ اسکولوں کالجوں کی سطح پر طلبہ نے انگریزوں کا بائیکاٹ کیا۔ انگریزی مال کا استعمال بند کر دیا۔

ڈاکٹر تاراچند ''تاریخ تحریکِ آزادی'' میں لکھتے ہیں:

''ملک ایک زبردست ہلچل سے دوچار ہوا اور جوش و خروش کی عدیم المثال لہر ہندوستان کے کروڑوں افراد میں پھیل گئی۔ ہر طرف جوش، مقصد میں لگن، قربانی کے لاثانی مناظر دیکھنے میں آئے۔ امتیازی حیثیتوں کے وکلاء جیسے موتی لال نہرو، سر آر. داس، راجندر پرساد، راج گوپال آچاریہ، نے اپنے اپنے منفعت بخش پیشوں کو ترک کر دیا۔ ہزاروں طلباء اپنے اپنے اسکول اور کالجوں سے باہر نکل آئے جواہر لال نہرو نے الہٰ آباد ہائی کورٹ کو الوداع کہا اور عدم تعاون کے بھنور میں کھنچ آئے''۔ [۲]

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ سر جان سائمن اس کے چیئرمین مقرر کیے گئے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کمیشن صوبوں میں حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔ ۱۹۲۷ء میں جب سائمن ہندوستان آیا تو پورے ملک میں سائمن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کمیشن کے ہندوستان میں آنے کا مقصد محض یہ تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کی آڑ میں ہندوستانیوں کو بدنام کرے۔ ہندوستانی

[۱] حسین علوی ''کاروانِ آزادی'' ص ۵۰۶

[۲] ڈاکٹر تاراچند ''تاریخ تحریکِ آزادی'' مترجم [illegible]

،کمیشن کی چال سمجھ گئے اورانہوں نے متحد ہوکر کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔بمبئی میں عوام کی قیادت محمد علی جناح کررہے تھے۔ادھر لالہ لاجپت رائے بھی احتجاج میں شامل تھے۔ایک احتجاجی جلوس میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائی گئیں جس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوگئی۔

سول نافرمانی

آزادی کے سلسلے میں چلائی جانے والی مختلف تحریکوں کو مسلسل مقبولیت سے ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہوتے رہے۔ان کے عزائم میں پختگی پیدا ہوگئی اور ہندوستان کے عوام نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی Civil Disobedience کی تحریک شروع کردی،اس تحریک کو بھی پُر امن طریقے سے شروع کیا گیا۔ ہندوستان کے عوام نے بلا امتیاز مذہب وملّت اس میں بھرپور حصّہ لیا۔کسی بھی تحریک کے جاری ہوتے ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھنے لگتے تھے عوام کے جذبے اور جوش کو دیکھ کر انگریز خائف تھے۔انگریزوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ہندوستان میں اب زیادہ عرصہ تک اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ مقتدر لیڈران کو گرفتار کرلیا گیا۔ان سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک تو مدھم پڑگئی لیکن آزادی کے تئیں محبانِ وطن کے جذبات میں مزید اضافہ ہوگیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب ''تحریکِ آزادی'' میں لکھتے ہیں:

''ہم نے آزادی اور حق طلبی کی جنگ میں ''نان وائلنس'' ''کوآپریشین'' کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر وتشدد اور خوں ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے، لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر، مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہئے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرتاً ورعدل واخلاق کے مطابق پیش کرتا

ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لئے مہاتما گاندھی کے دلائل سے متفق ہوں، اور ان کے دلائل کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلنس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہوگا اور اس کی اخلاقی و ایمانی طاقت کی ایک یادگار مثال ہوگی''۔ ۱

۱۹۲۸ء میں کانگریس، حکومت سے نوآبادیاتی حکومت کے سلسلے میں گفت وشنید کر رہی تھی لیکن حکومت، نوآبادیاتی حکومت کو ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ ہندوستانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر حکومت ہندوستان کو نوآبادیاتی حکومت کا درجہ مل جاتا ہے تو ہم تمام سیاسی سرگرمیاں واپس لے لیں گے۔ لیکن حکومتِ برطانیہ ہندوستانیوں کو کچھ دینا نہیں چاہتی تھی لہٰذہ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی۔

''برطانوی حکومت نے ایک سال کے عرصہ میں ہندوستان کو درجۂ نوآبادیاتی نہ دیا تو آئندہ کانگریس ''مکمل آزادی'' کو اپنا نصب العین قرار دے گی''۔ ۲

انگریزوں نے اس قرارداد کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا رہے، لہٰذا ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور کانگریس کے اجلاس میں رات کے ٹھیک بارہ بجے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس ہو گیا۔ یہ ریزولیشن انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں ایک اہم قدم تھا۔ ریزولیشن پاس ہونے کے بعد ہندوستان کے عمائدین سیاست اسے عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہوئے۔ کروڑوں عوام نے ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں آزادی حاصل کرنے کا حلف اٹھایا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ ہندوستانیوں کو ہر حیثیت سے تباہ کر دیا ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور کامل آزادی حاصل کر کے رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے

۱ ابوالکلام آزاد ''تحریک آزادی'' ص ۴۳

۲ شوکت علی فہمی ''انقلاب ... کی خونی داستان'' خواجہ پریس دہلی ص ...

آزادی حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم عدم تشدد کے اصول پر عمل کرتے ہوئے حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ سول نافرمانی کی تیاری کریں گے، جس میں محصول کا ادا نہ کرنا بھی شامل ہوگا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو کسی قسم کی امداد نہ دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال دلایا جائے تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا پندرہ روز میں خاتمہ ہو جائے گا۔ لہذا ہم صدقِ دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس ہم کو جو بھی ہدایت دے گی ہم اس پر عمل کریں گے۔ اور حصول آزادی کے لئے ہم ہر قسم کی قربانیاں دیں گے''۔ [1]

ہندوستانی اپنے عزائم پر عمل پیرا رہے۔ ادھر گاندھی جی نے قانون نمک سازی کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ ۱۲/ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی اٹھہتّر لوگوں کے ساتھ سابرمتی آشرم کیلئے روانہ ہو گئے اور گجرات کے دیہی علاقوں میں دو سو میل کا سفر کر کے ڈانڈی پہنچے جو ساحل سمند پر واقع ہے۔ نمک قانون سازی کے خلاف ملک میں تقریباً ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے گرفتاریاں دیں اور جیل گئے۔

کانگریس کی مقبولیت اور اس کی چلائی ہوئی تحریکوں کی مسلسل کامیابی کو دیکھ کر برطانوی حکومت کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ حکومت نے جدید اصلاحات کے بارے میں غور وخوض کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں لندن میں مسلسل ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں اس کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستانی ریاستوں کو خود مختاری کے حقوق حاصل ہو گئے اس طرح ہندوستانیوں کو مرکز میں بھی نمائندگی حاصل ہونے لگی۔

دوسری جنگ عظیم

۲/ ستمبر ۱۹۳۴ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ ادھر برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے۔ اس صورتِ حال کو مدنظر

[1] شوکت علی فہمی ''انقلاب کی خونریز داستان'' خواجہ پریس دہلی ص ۱۷۲

رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک خصوصی جلسہ منعقد کیا گیا۔اس جلسہ میں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ انگریز اسی طرح اپنے اغراض ومقاصد حل کرتے رہیں گے۔

ہندوستان چھوڑ وتحریک

موجودہ صورتِ حال پر غور وخوض کرنے اور آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں ''ہندوستان چھوڑ وتحریک'' Quit India Moment کا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا۔اس ریزولیوشن کے پاس ہوتے ہی انگریزوں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کرلیا گیا اور پوری طرح اس تحریک کو ناکام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔''ہندوستان چھوڑ وتحریک'' ملک گیر سطح پر شروع ہوگئی کیونکہ عوام مقتدر لیڈروں کی گرفتاری سے مشتعل ہو گئے۔ملک میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔سیاسی رہنما اس تباہ کن پالیسی کے خلاف تھے لیکن عوام کے جذبات کو نہ روک سکے۔ادھر انگریزوں کے انتقام کی آگ اور تیز ہوگئی اور اندھا دھند گرفتاریاں کرنے لگے۔

آزاد ہندفوج

یہی وہ زمانہ تھا جب نیتا جی سُبھاش چندر بوس کے دل میں ''آزاد ہندفوج'' کے قیام کا خیال پیدا ہوا اور ۲۶ رجنوری ۱۹۴۲ء کو انہوں نے جرمنی میں پندرہ سو ہندوستانیوں پر مشتمل ''آزاد ہندفوج'' کی تشکیل کی۔آہستہ آہستہ فوج کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ان میں جنرل شاہ نواز، جمیل خاں، لیفٹیننٹ ضمیر الحق، میجر گورمکھ سنگھ وغیرہ شامل تھے۔سبھاش چندر بوس نے اس دور کی سیاسی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے برلن ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا:

''آج جبکہ برطانوی سلطنت معدوم ہونے کو ہے تو ہندوستان کی آزادی کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔میں آپکو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان نے ۱۸۵۷ء میں اپنی آزادی کی پہلی

لڑائی لڑی تھی اور ۱۹۴۲ء میں اس نے اپنی آزادی کی آخری جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی دیوی تمہاری منتظر ہے۔ اٹھو! اور آگے بڑھو، فتح ونصرت تمہارے قدم چومنے کو بیتاب ہے۔ تمہارا منتہائے مقصود ہے ''آزاد ہند'' اس کے لئے تمہیں اپنی عزیز جانوں کی قربانی دینی ہے، نئے آزاد ہند کی تعمیر کرنا ہے جس میں کسی بیرونی طاقت کا عمل دخل نہ ہو، پوری آزادی ہو، جس میں ہر ہندوستانی کو اپنا مستقبل بنانے کی پوری آزادی ہو۔ ''آزاد ہند فوج'' کی بنیاد ایسے مجلسی نظام پر رکھی جائے گی جو انصاف، مساوات، اور اخوت کے پرانے اصولوں پر مبنی ہو''۔ ۱

اس سیاسی صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:

''میری تجویز کے مطابق انگریزوں کو بہت جلد ہندوستان چھوڑ دینا پڑے گا جسے آج کل انارکلی اور طوائف الملوکی کہا جاتا ہے ممکن ہے وہ اس انارکی کی بدولت کچھ عرصہ تک باغی جنگ و جدل یا لوٹ مار ہوتی رہے۔ اس عارضۂ طوائف الملوکی کو موجودہ ذلّت آمیز سامراج پر ترجیح دینی چاہئے''۔ ۲

ملک گیر سطح پر بغاوت کے نتیجہ میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کو اپنے خواب شرمندہ تعبیر ہوتے نظر آنے لگے اور انگریزوں کے پیر ہندوستان سے اکھڑنے لگے۔ اس صورت حال میں ۲۱ رفروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ ''جدوجہد آزادی'' کا مصنف لکھتا ہے:

''برطانیہ نے آخر کار اختیارات ہندوستان کو سونپنے کا فیصلہ کر لیا۔ تفصیلات طے کرنے کے لئے جن میں فوری اور آئندہ دونوں قسم کی تفصیلات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک کیبنیٹ کمیشن ہندوستان بھیجا گیا۔ مختلف تنظیمیں اور پارٹیوں کے رہنماؤں سے طویل اور تفصیلی گفتگو کے بعد کیبنیٹ کمیشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ان تجاویز کی توضیح میں اختلافات رونما ہو گئے۔ لیکن دیول کی خواہش تھی کہ

۱ امداد صابری سبھاش بابو کی تقریریں ص ۲۱

۲ [illegible] ''تحریک ۱۹۴۲'' [illegible] ص ۵۱

درمیانی مدت کی حکومت جلد اختیارات سنبھال لے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں کانگریس نے حکومت بنالی۔ جواہر لال نہرو مجلس وزراء کے سربراہ تھے۔ اکتوبر میں مسلم لیگ بھی کابینہ میں شامل ہوگئی لیکن انہوں نے آئین سازی کے کام میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیرِ اعظم نے اعلان کیا کہ زیادہ سے زیادہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ ہندوستان کو اختیارات سونپ دے گا''۔[۱]

آزادی اور ملک کی تقسیم

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اگست ۱۹۴۷ء ہی میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے حق میں تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک مصالحتی منصوبہ تیار کیا اور اختیارات کی منتقلی کو ایک سال اور قریب تر لے آیا۔ برطانوی حکومت نے بڑے غور وخوص کے بعد مایوس ہوکر ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو ہندوستان کی تمام جماعتوں سیاسی، لیگی اور کانگریسی رہنماؤں نے بخوشی منظور کر لیا اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دو الگ الگ ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔

[۱] جدوجہد آزادی از بپن چندا پلش ترپاٹھی، سرون ڈے (مترجمہ غلام ربانی تابار) اشاعت ۱۹۷۲ء ص ۲۷

تحریک آزادی

اور

اردو افسانہ

تحریک آزادی اور اردو افسانہ

اُردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح اُردو افسانوں نے بھی تحریک آزادی میں خاطر خواہ حصّہ لیا اور ہندوستان کے عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے جس سے حرّیت پسندوں کے عزائم میں اس تحریک کے تئیں پختگی پیدا ہوگئی۔

اُردو میں مختصر افسانے کی روایت زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ افسانہ مغرب کے اثرات سے آیا اور بہت کم عرصہ میں نثر کی تقریباً تمام تخلیقی اصناف پر غالب آ گیا۔ اور ادبی حلقوں میں مقبول ترین صنف ادب تسلیم کیا جانے لگا۔ اُردو افسانہ کی تاریخ میں پریم چند کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند افسانے کا رہنما ہے کیونکہ پریم چند نے افسانے کو فن دیا اور فن کی تعمیر بھی کی۔ لیکن پریم چند کو افسانے کا موجد کہنا مناسب نہیں۔ پریم چند سے قبل بھی مختصر افسانے کے نمونے مختلف رسائل میں مل جاتے ہیں۔ ان رسائل میں خصوصاً دل گداز، اودھ پنچ، خاتون، خدنگ نظر، مخزن الفاظ وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ پریم چند سے قبل جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مغربی افسانے کے فن اور اس کے تصور سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ان میں خاص طور سے سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، علی محمود بانکی پوری کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

وقار عظیم ''نیا افسانہ'' میں اُردو افسانے کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''ناول کی طرح افسانہ بھی اُردو میں انگریزی کے اثر سے آیا، ناول اس کے مقابلے میں ایک گمنام چیز بن کر رہ گیا۔ مختصر افسانے کی ابتداء ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی اور قومی رہنما اس انتشار سے گھبرا کر ملک کی نئی تحریک پھیلا کر عوام میں اپنے مٹتے ہوئے تمدّن کی محبت اور ان کی جگہ لینے والے ایک نئے نظام کی طرف سے محنت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے''۔ [1]

[1] وقار عظیم ''نیا افسانہ'' ۱۹۷۷ء ص ۱۷

پریم چند کے بغیر اُردو افسانے کی تاریخ ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہوکر ۱۹۳۶ء میں ختم ہوجاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی معاشرہ پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئے سماج میں قدم رکھ رہا تھا۔ مختلف قسم کی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پریم چند کی پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ۱۹۰۷ء میں ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوئی۔

افسانہ ''قاتل'' میں دھرم ویر ایک اہم کردار ہے جو ایک قوم پرست سبھا کا کارکن بھی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں محبِّ وطن ہے اور اعتدال پسند ہے۔ وہ دھرم ویر کے انتہا پسند رویّے کو پسند نہیں کرتی اور اس سبھا پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتی ہے۔ دھرم ویر اپنی بوڑھی ماں سے کہتا ہے:

''جو تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے''۔

بوڑھی ہوں، جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی، دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہوگئی تھی اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص وانہماک سے خدمتِ قوم میں مصروف تھی''۔ [۱]

بوڑھی ماں اور دھرم میں گفتگو جاری ہے۔

دھرم ویر! وہ (انگریز) ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہوجائے گا کہ وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج ہی سوراج مل جائے گا، روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل

[۱] پریم چند ''قاتل'' ص ۲۶

کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہوتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں''۔ ا

غرض کہ ابتدا سے آخر تک افسانے میں دھرم ویرا نتہا پسند اور جذباتی نظر آتا ہے اور پورا افسانہ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔

عزیز فاطمہ ''افسانے کا سماجی وثقافتی پس منظر'' میں لکھتی ہیں:

''ملکی وبین الاقوامی سیاسی تحریکیں اکثر افسانوں کا محرک رہیں، سیاسی تحریکیں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے افسانہ نگاروں کے مواد کو فراہم کرتی رہتی ہیں۔ سیاسی افسانوں کی ابتداء پریم چند سے ہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' حکومت نے ضبط کرلیا''۔ ا

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف تحریکوں کو لیکر آیا۔ نئے رجحانات سامنے آئے، اور سیاست نے نیا موڑ لیا۔ ہندوستان کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ چین، ترکی، اور ایران میں بھی یہی صورت نظر آتی تھی۔ اسی دوران یعنی ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر نوجوان طبقہ بھی متحرک ہوگیا۔ اسی سال ہندو مہاسبھا کی داغ بیل پڑی۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں شامل پریم چند کی کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان سے بغاوت کی بُو آتی تھی۔ جو انگریزوں کی جابرانہ عملداری کے خلاف تھی۔ لہذا حکومت نے اس مجموعہ کو ضبط کرلیا۔

''سوز وطن'' کی کہانیوں کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں:

''کتاب نکلے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا (جو انگریز تھے) پروانہ پہنچا کہ فوراً مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ انکے سامنے

ا پریم چند ''قاتل'' ص ۲۶

۲ عزیز فاطمہ ''اردو افسانے کا سماجی وثقافتی پس منظر'' ص ۹۱

''سوز وطن'' کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟ میں نے کہا ہاں''۔

صاحب نے ایک کہانی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور آخر میں بگڑ کر بولے تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریز عملداری ہے،مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔تمہاری کہانیاں ایک طرفہ ہیں۔تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے''۔ [1]

پریم چند پر باغی ہونے کا الزام لگا دیا گیا اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ حکومت اور خصوصاً کلکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی کہانی شائع نہیں کرا سکتے۔''سوز وطن'' پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ان کہانیوں میں ''دنیا کا سب سے انمول رتن''۔''شیخ مخمور''،''یہی میرا وطن ہے''، ''صلہ ماتم''،''عشق دنیا'' اور ''حب وطن'' شامل ہیں۔پریم چند ''سوز وطن'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچّی تصویر ہوتا ہے، جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے۔اس زمانہ کی یادگار بجز عاشقانہ غزلیں اور کچھ چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔دوسرا دور اسے سمجھنا چاہئے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور

[1] قمر رئیس ''پریم چند شخصیت اور کارنامے'' ۱۹۸۳ء ص ۳۲۸

یقیناً جوں جوں ہمارے خیال وقیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِّ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں''۔ [۱]

''سوز وطن'' کے افسانوں سے بغاوت کی بُو آتی ہے اور ''حب الوطنی کے جذبات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اس جُملے پر ختم ہوتا ہے۔ ''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے''۔

''یہی میرا وطن'' سوزِ وطن کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مُرقع ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر کے اپنے وطن کے دیدار کی تمنّا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ہے۔

''عشق دنیا'' اور ''حُبّ وطن'' کا موضوع بھی حب الوطنی ہے۔ اس افسانے میں اٹلی کی محبّ وطن ''میری'' کی حسرت ناک زندگی کے چند عبرتناک مناظر کو بیان کیا گیا ہے، جو ہندوستانیوں کے دلوں کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔

سوز وطن کی کہانیوں میں ''صلہ ماتم'' کو چھوڑ کر باقی چار کہانیوں میں ہمیں ایک ایسے سچّے دردمند اور پُرخلوص عاشق وطن کی روح مچلتی اور تڑپتی نظر آتی ہے، جو وطن کی ہر چیز اور خصوصاً وطن کی آزادی کو والہانہ جذباتیت کے ساتھ یک روحانی انداز سے دیکھتا ہے۔ وطن کی آزادی اور وطن کی محبت کے احساس پر اقتصادی اور معاشی اہمیت نے آگے چل کر جو غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی جذباتیت اور روحانیت اس سے قطعی نا آشنا ہے۔ اس کے نزدیک وطن سے محبت کرنا اور اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کر دینا انسانی فریضہ ہے۔

وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' میں پریم چند کے افسانوں کی سیاسی اور قومی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عبدالماجد دریا آبادی کی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[۱] قمر رئیس ''پریم چند شخصیت اور کارنامے'' ۱۹۸۳ء ص ۳۲۸

''ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم آج سے سو پچاس برس بعد کا لگے گا تو اس میں تیس بتّیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری، اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے''۔ [۱]

پریم چند محبّ وطن تھے انہیں وطن سے بے پایا محبت اور لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے غریب عوام ہوں یا دیہاتوں کے کسان، وطن کی زمین ہو یا وطن کا ماحول وہ اپنے وطن سے خاص انسیت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ ہنسراج رہبر پریم چند کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں نے افسانوں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ وطن اور انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دور تک ہندوستان سیاسیات میں تیزی سے تغیر پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ پریم چند نے بڑی لگن کے ساتھ اس تغیر کا ساتھ دیا۔ کانگریس سے تو انہیں اپنی فکر کے لئے غذا ملتی رہتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ دوسری سماجی اصلاحی تحریکوں سے بھی اثر لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے، گوکھلے، تلک، لاجپت لائے وغیرہ کی سماجی اور سیاسی اصلاح کی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے''۔ [۲]

پریم چند کے ان افسانوں میں جو خصوصاً جنگِ آزادی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ڈامل کا قیدی، قاتل، آخری تحفہ، جیل، جلوس، آشیاں بربادؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں آزادی کی تحریکات اور تحریکِ ترکِ موالات کے واقعات بھی نظر آجاتے ہیں۔ افسانہ ''لال فیتہ'' میں سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے اور سرکاری ملازمتوں سے عوام کے مستعفی ہونے کے واقعات ملتے ہیں۔ پریم چند کے اسی طرح کے افسانوں میں ''راج ہٹ'' ''منزل مقصود'' اور آہ بیکس'' شامل ہیں۔

[۱] وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' ص ۲۶۳

افسانہ ''آخری تحفہ'' اس کے کردار سودیشی اور پکٹنگ کی تحریکوں میں حصّہ لیتے ہیں۔اس میں امرناتھ اور مالتی دو اہم کردار ہیں۔امرناتھ محبّ وطن ہے وہ ان تحریکوں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے۔اسی طرح افسانہ ''جیل'' میں وشومبر کا کردار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ بی۔اے۔کا طالب علم ہے اور اپنی تعلیم کی پرواہ کئے بغیر سودیشی تحریک میں حصّہ لیتا ہے۔روپ متی اس کی جرات اور حوصلے کو خوش آمدید کہتی ہے اور اس کی تعریف کرتی ہے۔

افسانہ ''آشیاں برباد'' میں عورتوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے کے مرکزی کردار ''مرولا'' کی شکل میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے جو ظلم رسیدہ ہونے کے باوجود عالی ہمّت اور بلند حوصلہ ہے۔اور آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔اس کا بیٹا،شوہر، اور ماں جنگ آزادی کے لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔اس کے یہ الفاظ اس کی بلند حوصلگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

''.....ایک بار جی میں آیا بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں،سارا کنبہ ایک ساتھ، ایشور کے دیار میں جا پہنچے۔لیکن پھر میں نے سوچا تو نے بھی ایسا کام ہی کونسا کیا ہے،جس کا معاوضہ یہ ملے''۔[۱]

اس افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے' شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔.....لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں،مستعد ہیں۔میدان سے ہٹتے نہیں۔ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں۔.....وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں، اور حکومت کریں گے۔تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پرواہ بھی نہیں' جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی

[۱] پریم چند ''آشیاں پرساد''

گئی.......آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس مرتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں''۔ [۱]

دُوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے سفّاکانہ مظالم نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ، حکومت کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک، ہندوستانیوں کی اہانت اور استحصال، یہ سب وہ امور تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ اور بیدار کرنے اور ان کے ارادوں کو مصمم بنانے کی فضا پیدا کر دی۔ سارا ملک آزادی کی لہر میں آ گیا۔ مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہوگئی۔ وطن کی محبت نے کروڑوں عوام کے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔

۱۹۲۹ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اخباروں نے مضامین کے ذریعے اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آزادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔

اس سلسلے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:

''اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین الاقوامیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا''۔ [۲]

پریم چند نے اپنی تحریروں میں خصوصاً افسانوں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے ایسے دور میں قدم اٹھایا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا۔ انگریز حکمراں ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پورا ملک افراتفری کے عالم میں مبتلا تھا۔ حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور ان کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پریم چند نے ان تمام موضوعات کو

۱ پریم چند ''آشیاں پرساد''

۲ [illegible] کانفرنس نمبر ص ۸۹

اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

۱۹۳۶ء میں پریم چند کی وفات ہوگئی لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اُردو افسانہ نگاری میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی اردو ادب کی فضاؤں کو آج منور کئے ہوئے ہے۔ ان چراغوں سے بعد کے افسانہ نگاروں نے کسب نور کیا اور پریم چند کے خیالات وتصورات کی ترجمانی اپنے افسانوں کے ذریعے کی۔

اُردو افسانہ پریم چند کے بعد

پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''انگارے'' کے پس منظر میں اس دور کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے اوائل میں اپنی ابتداء ہی سے افسانہ میں یلدرم کے ہاتھوں میں جس رومانیت اور پریم چند کے ہاتھوں مثالیت پسندی کے باوصف جس حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی تھی وہ الگ الگ باقاعدہ رجحان بن کر مستحکم روایتیں بن چکی تھیں ''انگارے'' اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقی زندگی پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی بیچارگی طبقاتی استحصال، امن کی خواہش غربت اور افلاس متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن محبت پر پابندی، بیکاری، جنسی گھٹن، ایثار، قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری، اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سینکڑوں شکلوں میں افسانے بنے''۔[۱]

وقار عظیم ''انگارے'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''انگارے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا

[۱] احتشام حسین، عکس اور آئینے'' ۱۹۶۲ء ص ۱۳۴

فنی امتزاج ہے۔انگارے کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب وغریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں بھی جن میں رورعایت کہیں نہیں اور آزادی اور بیباکی، خیال ہر جگہ ہے۔ان کی مصوری میں تلخ طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ اور اس تلخ طنز میں کہیں کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز کو چھوڑ کر تسخر جھنجھلاہٹ اور بعض جگہ ابتذال کی شکل اختیار کر لی ہے''۔ [۱]

انگارے کی اشاعت کے فوراً بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔وہ دور ملک میں قومی بیداری اور قومی شعور کا دور تھا۔ملک کے سیاسی اور معاشی حالات اور برطانوی عملداری کے سخت رویّوں نے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے احساس کو جھنجھوڑا۔ بین الاقوامی سیاست نے بھی ہندوستان کی سیاست کو براہِ راست متاثر کیا اور ادھر لوگوں کی توجہ انقلاب روس فاسزم اور اس کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے امکانات نے ہندوستان کے عوام کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا، یورپ اور امریکہ کے دانشور بھی ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔اور متحد ہو کر عوامی تحریکوں میں حصّہ لینے لگے۔اس کے اثرات سے ہندوستان کے نوجوان جو انگلینڈ کی مختلف دانش گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ان نوجوانوں نے ایک ادبی حلقہ تشکیل کیا ان میں سجّاد ظہیر، محمد دین تاثیر، محمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، اور پرمود سین گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں جو اعلان نامہ منظور کیا گیا اس کو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردّعمل کے آثار پائے جائیں گے، انہیں اختیار کریں گے۔

ہم اپنی انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تمدن سے فائدہ اٹھائیں

[۱] وقار عظیم ''نیا افسانہ'' ص ۶۳

گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہمارے قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور ارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کے ذریعے سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد ہوں گے۔

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہلِ ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال کی حفاظت کرنا''۔ [۱]

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ابتداء ہی سے سیاست کے ساتھ براہ راست اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ بہت سے نوجواب ترقی پسند ادیب سیاست میں عملی حصّہ لیتے تھے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک کا ایک مقصد رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرنا تھا۔

سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے محرّک تھے انہوں نے ایک کتاب ''روشنائی'' کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ سجّاد ظہیر ''روشنائی'' میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ترقی پسند ادبی تحریک کا رُخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ

[۱] ہنسراج رہبر ''ترقی پسند ادب'' ایک جائزہ ۱۹۶۷ء ص ۲۲۔۳۲۱

طبقہ کی جانب ہونا چاہیئے۔ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدو جہد اور وطن کے عوام کو اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصّہ لیں۔صرف دور کے تماشائی نہ ہوں۔ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے اُنس، اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔بغیر انسان دوستی، آزادخواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔اس لئے ہم اعلانیہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ آزادی اور جمہوریت کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور غریب کسانوں اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصّہ بنیں''۔ [۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کا مقصد زبوں حالی اور درمیانہ طبقہ کی حمایت، سماجی استحصال کی مخالفت اور سماج میں پھیلی ہوئی بے چینی کو دور کرنا تھا وہاں اس کا ایک اور اہم مقصد انگریزوں کی مخالفت اور آزادی کی حمایت تھا۔

انجمن کی کُل ہند کانفرنس دوری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ ترقی پسند مصنفین جمہوری حقوق کی جماعت میں اپنی آواز بلند کر چکے تھے اس اجلاس میں ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی گئی اور اس قرارداد میں کہا گیا کہ:

''ہم برطانوی سامراج کے اس رویّے کی مذمّت کرتے ہیں کہ وہ اِن نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں''۔ [۲]

حسرت موہانی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی اہمیت اور اس کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے

۱ سجاد ظہیر ''روشنائی'' لاہور ایڈیشن ص ۷۶۔۷۸

۲ سجاد ظہیر ''روشنائی'' لاہور ایڈیشن ص ۲۸[illegible]

والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیے اور عام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنی چاہیے۔اس میں عوام کے دُکھ سُکھ ۔ان کی بہترین خواہشوں اور تمنّاؤں کا اس طرح اظہار ہونا چاہئیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور منظّم ہو کر اپنی انقلانی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں''۔ [1]

پریم چند کی افسانہ نگاری اور ''انگارے'' کی اشاعت کے بعد ترقی پسند تحریک نے بھی اُردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ترقی پسند افسانہ نگاروں نے سماجی سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سدرشن، اعظم کریوی،علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے نام خاص ہیں۔

افسانہ نگاروں میں پریم چند کے بعد سب سے زیادہ معتبر نام کرشن چندر کا ہے۔کرشن چندر نے ناول اور افسانہ دونوں میں دانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ان کے افسانوں میں خوبصورت منظر، فطرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتوں نیز سیاسی حالات و واقعات کی بھرپور تصویر کشی ملتی ہے۔معین عقیل نے کرشن چندر کے موضوعات اور رجحانات کے بارے میں لکھا ہے:

''کرشن چندر کے انقلابی رجحانات کے زیرِ اثر جنگ، سامراج اور فاشیت بھی موضوع بنے ہیں اور ان کی موضوعات میں سماجی معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ایک مخصوص سماجی اور سیاسی ماحول میں رہ کر ایک مخصوص نظریئے کے تحت انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔انکی تحریروں میں ہمیں جو ماحول ملتا ہے وہ سیاسی طور پر غلام اور سماجی طور سے پس ماندہ ہے اور ان دونوں کے اسباب انگریز قوم اور سرمایا دارانہ نظام ہیں۔ ہر طرف بھوک ہے، قحط ہے اور غلامی ہے۔ ہر افسر ایک ظالم اور سفّاک افسر ہے۔ جسے اس ملک کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ماحول کرشن چندر کو انسان دوستی اور سماجی رشتوں کو سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ انکی انسان دوستی

[1] سجاد ظہیر ''روشنائی'' لاہور ایڈیشن ص ۱۳۱

بعد میں گہری سے گہری رومانی فضا میں بھی انسانیت کی آزادی کے پرچم کو بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے رومانی انداز میں انسانیت کی آزادی اور محبت کی آزادی کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جب وہ سماجی رشتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس بڑی حکمراں طاقت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جس نے زندگی اور فطرت دونوں ہی کے حسن پر قبضہ جمالیا تھا۔ کرشن چندر نے انسان دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار سے انسان کی آزادی اور ہندوستان کی آزادی کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا''۔ [1]

۱۹۳۶ء کے بعد افسانہ نگاروں نے جو افسانے تخلیق کئے ان میں کرشن چندر کا افسانہ ''دو فرلانگ لمبی سڑک''، احمد علی کے افسانے ''ہماری گلی'' اور ''میرا کمرہ''، منٹو کا ''نیا قانون''، حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش''، موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین افسانے تصوّر کئے جاتے ہیں۔

ان سے ذرا آگے بڑھ کر احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ابراہیم جلیس، اختر اورینوی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

احتشام حسین اس دور کے ادیبوں کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے ''روایت اور بغاوت'' میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں اُردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ فرقہ واریت انگریز سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اگر ہندوستان کی تقسیم ہونا ہی ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس کی تقسیم اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو''۔ [2]

پریم چند اور کرشن چندر کے بعد افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک اور معتبر نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار تھا۔ اس کا فنّی شعور اور اصابت فکر، رجحانات اور خیالات

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۵۷۶۔۷۷

[2] احتشام حسین ''روایت اور بغاوت'' ۱۹۷۲ء ص ۱۷۹

اپنے معاصرین ومختلف ہیں۔ایک طرف منٹو نے جنسی مسائل اور معاملات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے تو دوسری طرف اپنے عصری سیاسی مسائل سے بھی باخبر نظر آتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں سیاسی مسائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

معین عقیل منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منٹو کا فنّی شعور افسانہ نویسی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ان کے عام افسانوں میں طوائف کی زندگی اور جنسی الجھنوں سے دوچار نوجوانوں کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے مناظر، سیاسی جلسے، جلوسوں پر پولیس کی گولہ باری، گلیوں بازاروں میں مسلح فوج کا راج، جیل خانے، مارشل لاء۔ بغاوت کو ختم کرنے والی برچھیاں اور گولیاں، ایک نئے قانون کی خواہش، انقلاب کے نعروں کی گرما گرمی جیسے موضوعات بکثرت ملتے ہیں۔ان کے بے شمار موضوعات میں خصوصیت سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی منظر کشی ہے''۔[۱]

منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی معاملات وکوائف کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے جن افسانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ جو سیاسی حالات کے مکمل طور پر ترجمان ہیں۔ ان میں 'نیا قانون'، 'نعرہ'، 'شرابی'، 'تماشا'، 'ماتمی جلسہ'، 'دیوانہ شاعر'۔سوراج کے لئے خاص ہیں۔

منٹو کا افسانہ ''تماشہ'' ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے۔''شرابی'' اس کے بعد کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز اور صورت حال کو پیش کیا ہے۔افسانہ ''شرابی'' کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کئے جارہے ہیں۔

''آہ آزادی.....خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا۔ان آزاد لوگوں کی حالت پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے.....اس کا جواب مجھے نہیں ملتا''۔ [۲]

[۱] تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ ص ۳۷۷

[۲] منٹو فن ''شرابی''

افسانہ نگار اپنی غلامی، بے بسی، اور مظلومی کا احساس اس طرح بیان کرتا ہے۔

''قصوروار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لئے کھڑے رہتے ہیں''۔ میں نے جواب دیا ''ہندوستان کے ۲۵ کروڑ باشندے اپنی چھپی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے اگر ظلم کا کٹا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور ہم اس لئے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو انکے ظلم سے مفلوج ہے.....''۔ [۱]

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ٹڈی دل پر کتنے لوگ حکومت کر رہے ہیں، آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں.....حاکم ہرگز ملعون نہیں ہو سکتے ہمارا وطن خوف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند کو دور کر دیجئے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی''۔ [۲]

منٹو کے افسانے ''نیا قانون'' کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے۔ جو غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی عصری حالات سے باخبر اور سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے۔ منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ منگو انگریزوں کے بارے میں کہتا ہے:

''(انگریز) آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک بن گئے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں.....''۔ [۳]

پروفیسر محمد محسن نے اپنی کتاب ''منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' ملک کے سیاسی تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

''ملک میں آزادی کی لہر تیزی سے پھیل رہی تھی، ملک کی غلامی کو غربت، جہالت، بیروزگاری اور ساری دوسری اقتصادی اور اخلاقی گراوٹوں کا سبب قرار دیا جانے لگا تھا۔ منٹو بھی ان عصری تقاضوں سے متاثر ہوا اور اس نے چند اچھے افسانے بھی لکھے جن کا مقصد سیاسی اور سماجی بیداری کی اس لہر کو ہوا دے کر عوام کے دلوں میں بغاوت کے جذبات کو بھڑکانا تھا''۔ [۴]

منٹو نے جہاں ایک طرف اپنے افسانوں میں جنسی مسائل سے بحث کی وہاں انہوں نے

۱۔ منٹو افسانہ ''شرابی'' ۲۔ منٹو افسانہ ''شرابی'' ۳۔ منٹو افسانہ ''نیا قانون''
۴۔ محمد محسن ''منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' ۱۹۸۲ء ص ۱۲۱

آزادی کی تحریکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے افسانوں میں جلیانوالا باغ کا حادثہ، احتجاجی جلسے، آزادی کے متوالوں پر مظالم اور آزادی کی تڑپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ منٹو کے اس طرح کے افسانوں میں ''نیا قانون''۔ ''نعرہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''نو بہ ٹیک سنگھ'' اور ''سوتری'' ہندوستان کی تقسیم پر ایک فنکارانہ طنز ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے سیاسی اور سماجی نا ہمواری بے راہ روی اور ناانصافی پر ان کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کے بھی گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

بقول معین عقیل:

''احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ بڑا وسیع ہے اس میں زندگی کچھ محدود نہیں۔ اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ انہیں مجرد حالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کے افسانوں نے پنجاب کے دیہات کے مخصوص رومانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح اور مرکز چوپال کے علاوہ انقلاب زمانہ، عصری تحریکات خصوصاً خلافت تحریک، انقلاب و آزادی کی جد و جہد، ایسے موضوعات ہیں جن کا افسانوں میں گہرا عکس موجود ہے''۔ [1]

احمد ندیم قاسمی نے خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کی رومانی فضا کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی تحریکوں بالخصوص آزادی کی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انکا افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد'' دوسری جنگ عظیم کے حالات وکوائف کے پس منظر میں تخلیق کیا ہوا ہے۔

ابراہیم جلیس نے بھی سیاسی حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۵۸

اپنے افسانوں کے ذریعے غیر ملکی ناجائز سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کا نعرہ لگایا۔ اور ملک میں پھیلی ہوئی معاشی بدحالی کا ذمّہ دار بھی انگریز کو قرار دیا۔ جلیس کے اس طرح کے افسانوں میں ''چالیس کروڑ بھکاری''، ''رذیل''، ''زرد چہرے''، ''تکونا دیس''، ''ہندوستان چھوڑو''، ''انوچی ایڑی کی گرگابی''، ''ہمیں امن نہیں چاہئے''، ''بنارس کی ساڑی''، ''عریاں''، ''تیری اور میری آنے والی نسل'' ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں انگریز عملداری کے ظلم و استبداد، فرقہ واریت، کسانوں کے استحصال کی سخت لعنت کی گئی ہے اور جو اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی پریم چند سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اردو کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے عصری سیاسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔

تحریک آزادی

اور

اُردو ڈرامہ

تحریک آزادی اور اردو ڈرامہ

اُردو کی نثری اصناف میں ڈرامہ بھی ایک مقبول صنفِ ادب ہے۔ اگر چہ اُردو میں ڈرامے کی روایت زیادہ وقیع نہیں ہے۔عشرت رحمانی کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ:

''ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمل یا ایکشن کے ہیں۔ ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔قدیم زمانے سے لیکر آج تک فنّی اصطلاح میں ڈراما کا اطلاق اس صنفِ ادب پر ہوتا ہے جس کے الفاظ میں گفتار کی متحرک قوت اور کردار میں عمل اور ارادہ کی کیفیت موجود ہو۔عملی تجربات کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ ''ڈراما'' ادبیات عالم میں منفرد صنف ہے''۔ [1]

ڈرامے کی ترویج وترقی کے سلسلے میں پارسیوں کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے لیکن ان کا مقصد خالص تجارتی تھا۔اس لئے ابتدائی ڈراموں میں ملکی وقومی مسائل سے بحث اور سماجی کشمکش نظر نہیں آتی۔البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تخلیق کئے ہوئے ڈراموں میں ملکی اور قومی جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ڈرامہ کا اسٹیج سے گہرا تعلق ہے اس لئے ڈرامہ اور اسٹیج ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ اسٹیج کے بغیر ڈرامہ کا تصور ممکن نہیں۔موجودہ دور میں ڈرامے اسٹیج کرنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے اس لئے ڈرامے بھی کم تخلیق کئے جارہے ہیں۔

موضوعِ زیرِ بحث کے تعلق سے انہیں نمائندہ ڈراموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں قومی اور سیاسی شعور زیرِ بحث رہے۔اس طرح کے ڈراموں میں اس دور کے سیاسی حالات سے بحث اور ملک میں قومی شعور کی بیداری کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جن ڈرامہ نگاروں نے خاص طور پر مقبولیت اور شہرت حاصل کی ان میں آرام، رونق بنارسی، حافظ عبداللہ، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی اور احسن لکھنوی کا نام

[1] عشرت رحمانی ''اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید'' ص ۲۰۵

امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

عشرت رحمانی ''اُردو ڈرامہ کی تاریخ وتنقید'' میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے ڈرامہ نگاری کا سیاسی پس منظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں طویل سیاسی جدوجہد کے دوران کئی ڈرامہ نگاروں نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کئے۔ یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے تھے۔ ان میں سیاسی جذبات واحساس اور شعور عام نظر آتا ہے۔ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اور قومی بیداری کے مقاصد معلوم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور اس زمانے کے تھیٹر کمپنیوں نے جگہ جگہ انہیں اسٹیج کیا۔ بعض ڈراموں کے سلسلے میں حکومت نے کئی کمپنیوں کے خلاف کاروائی بھی کی۔ بھاری جُرمانے کئے اور کمپنیاں ضبط ہوئیں''۔ ۱

''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ'' میں معین عقیل لکھتے ہیں:

''بعض ڈراموں میں محض سیاسی واقعات وحالات پیش کئے گئے ہیں اور بعض میں کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر واستبداد اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے اور چند ڈراموں میں آزادی کی اہمیت، حصولِ آزادی کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات اور خیالات بیان کئے گئے ہیں''۔ ۲

اُردو میں تو متعدد ڈرامے تخلیق کئے گئے لیکن سیاسی ڈراموں میں اُردو کا پہلا ڈرامہ ''فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت'' لکھا گیا۔ عبدالعلیم نامی نے اس ڈرامے کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ:

''اُردو میں سیاسی موضوعات پر پہلا ڈرامہ ''فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'' ہے جو ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں اسٹیج کیا گیا''۔ ۳

۱ عشرت رحمانی اردو ڈرامہ کی تاریخ وتنقید، ص ۲۰۸ ۲ معین عقیل ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ ص ۵۸۹

۳ عبدالعلیم نامی اردو تھیٹر ۱۹۶۳ء جلد دوم ص ۳۰۰

''فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'' کے بارے میں کوئی مزید معلومات فراہم نہیں ہوسکی۔ اس کے کافی عرصہ بعد ۱۸۹۳ء میں امراؤ علی لکھنوی نے 'البرٹ بل' کے نام سے ایک ڈرامہ تخلیق کیا۔ اس ڈرامے میں ابتدا سے آخر تک برطانوی حکومت کے مظالم، جور وستم اور جبر واستبداد کو دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو کس کس طرح اپنی فریب کاریوں سے غلام بنائے رکھا اس داستان کو بھی دہرایا گیا ہے، اور انگریزوں کو متکبر، متعصب اور ظالم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے کرداروں میں مسٹر ہارش، مسٹر پریجوڈس، مسٹر اینگر، مسٹر براؤڈ، کو اسم بامسمّٰی دکھایا گیا ہے۔ ڈرامہ کے آخری حصّہ میں ہندوستانیوں کو سُرخ رو اور فتحیاب دکھاتے ہوئے ترمیم شدہ ''البرٹ بل'' وائسرائے کونسل منظور ہونے کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اُردو کا اہم ڈرامہ مولانا ظفر علی خاں نے ''جنگ روس و جاپان'' تصنیف کیا تھا۔ اس ڈرامے کے بارے میں معین عقیل کا خیال ہے:

''یورپ کی آخری انیسویں صدی کی جنگی حکمت عملی کو ''مرض جوع الارض'' قرار دیا ہے۔ ظفر علی خاں نے جاپانیوں کی قوم پرستی کے ذکر سے ہندوستانیوں کو سبق حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں ایسے کردار پیش کئے گئے جو ہندوستانیوں کیلئے مثالی ہو سکتے ہیں۔ ضعیف، بیوہ ماں کا محض اس خیال سے خودکشی کرنا کہ اس کے بعد اس کا لڑکا ماں کی خدمت کے بجائے ملک وقوم کی خدمت کر سکے۔ اور اس نوجواب کا دھیان صرف ملک وقوم کی خدمت کی طرف رہے۔ طفل مکتب کا مدرسہ کے اوقات کے بعد مٹھائی بیچ کر جنگی فنڈ میں روپیہ دینا محکوم ہندوستانیوں کے لئے مشعلِ راہ ہوسکتا تھا۔ اس ڈرامے کے ذریعے یورپ کے مقابلہ میں ایشیا کی برتری کے احساس کو بیدار کرنا بھی تھا۔ جو فی الواقعی جاپان کی روس کے مقابلہ میں فتح ۱۹۰۵ء کے بعد ایشیاء میں پیدا ہورہا تھا''۔[1]

اس کے علاوہ متعدد ایسے ڈرامے تخلیق کئے گئے جن میں حب الوطنی اور ملک وقوم کی

[1] معین عقیل'' تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ''، ص ۵۹

خدمت کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔مثلاً اصغر نظامی کے ڈرامے ''قومی دلیر'' سے ہندو مسلم اتحاد و یگانگت جھلکتی ہے۔عبداللطیف نے ''ہمارا گھر'' تصنیف کیا تھا۔اس ڈرامہ کا مرکزی کردار ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں سے بے پایاں محبت کرتا ہے۔اور قومی یک جہتی و یگانگت میں یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنا تمام سرمایہ سوراج اور خلافت فنڈ کو دے دیتا ہے۔ اسی طرح عباس علی نے ''لیڈی جونتی'' اور ''شاہی فرمان عرف دیش اپدیش'' تخلیق کئے۔آخر الذکر ڈرامے کا مرکزی کردار رام ناتھ اخبار ''ہندو درپن'' کا ایڈیٹر ہے۔رام ناتھ انگریزوں کی بدعنوانیوں اور حکمت عملی کی خامیوں پر تنقید کرتا ہے۔محشر انبالوی کا ڈرامہ ''غریب ہندوستانی عرف انقلاب یعنی سودیشی تحریک'' ہے۔انہوں نے اس ڈرامے میں ہندو مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے کردار ہری پانڈے اور شیو پانڈے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اس طرح کے موضوعات پر ریاض دہلوی نے ''مسلم پجاری'' میں اور نصیر انبالوی نے ''وطن'' میں پیش کئے ہیں۔

دل لکھنوی کا ڈرامہ ''تاج محل'' ہندو مسلم یگانگت اور یک جہتی پر مبنی ہے۔ایک دوسرے ڈرامے میں ہندوستانیوں کی جد و جہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔لکھنوی کے ڈرامے 'وطن'، 'مادر وطن' اور 'حب الوطن' خاص ہیں۔انہوں نے ان ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو نمایاں کیا ہے۔اور بتایا ہے کہ وطن کی محبّت ہر ہندوستانی کا فرض ہے اور غلامی سے نجات کے لئے ہندوستان کے ہر فرد کو جد و جہد کرنی چاہئیے۔

محی الدین عزم کا ڈراما ''دیش کی پکار'' ایک اہم ڈرامہ ہے۔اس ڈرامے کے ذریعے انہوں نے ہندوستانی عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔''گوشۂ افلاس عرف خون حسرت'' کے عنوان سے وحشت دہلوی نے ایک ڈرامہ تصنیف کیا تھا۔اس میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی ہے۔وحشت دہلوی نے اس ڈرامے میں سرمایہ داروں کے مظالم اور

عوام کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔

''بیداری'' اظہر دہلوی کا اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں آزادی کی تحریکوں کا پورا سیاسی تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً تحریک عدم تعاون کی حمایت، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مارشل لاء، سودیشی تحریک کے مختلف واقعات اور ان کے عواقب بیان کئے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جدو جہد میں حصّہ لینے اور قربانیاں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مثال کے طور پر اظہر دہلوی کے ڈرامے ''بیداری'' کے چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔

''امرت: جلیانوالہ باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی ہے۔ بے گناہ اور نہتّے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کر دی گئی اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔

بخشی: ''بے شک عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کہ قاتلانِ جلیانوالہ باغ کو عبرت انگریز سزا نہیں دی جائے گی۔ اور جب تک خلافت کا فیصلہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا''۔

امرت: ''مگر یہ باتیں سوراج کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں''۔

بخشی: ''بے شک نہیں ہوسکتیں۔ اسی لئے کانگریس اور مسلم لیگ نے سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے''۔ [1]

سردار جعفری کا ڈرامہ ''یہ کس کا خون ہے'' پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں ہندوستانیوں کی جدو جہد، شجاعت اور بہادری کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھیم اور ارجن، اکبر اور ٹیپو، جھانسی کی رانی، اور بھگت سنگھ کی روح ہے۔

[1] اظہر دہلوی ''بیداری'' بحوالہ نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی ۱۹۵۷ء ص ۱۹۵

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ڈراموں کا ایک مجموعہ ''نئی تصویریں'' سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا ان ڈراموں میں ''ہیلڈرک'' ہے جس میں دوسری جنگ عظیم کے واقعات ہندوستان کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا ڈرامہ ''مارشل تمونکو'' ہے اور تیسرا ڈرامہ ''لال جھنڈا'' ہے۔

لالہ کشن چند زیبا کا ڈرامہ ''شہید وطن'' موتی لال نہرو کی زندگی پر محیط ہے۔اس میں دکھایا گیا ہے کہ موتی لال نہرو اپنے پورے خاندان کے ساتھ اپنی زندگی ملک وقوم کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیتے ہیں۔ شہیدِ وطن کے دیباچے میں یہ اشعار درج ہیں:

پرورش کیا کیا کیے گوہر زمینِ ہند نے
کیسے کیسے لال اگلے سرزمینِ ہند نے
روشنی خورشید نے لی جن کی آب وتاب سے
ہے غلامی کو بھی سکتہ جن کے رعب وداب سے

نورالٰہی محمد عمر کا ڈرامہ ''روح سیاست'' پنڈت نہرو اور ابراہم لنکن کی سیاسی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں دونوں کی ملکی، سیاسی اور ملّی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

اشتیاق حسین قریشی کا ڈرامہ ''نقش آخر'' جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مبنی ہے۔ ڈرامہ کا مرکزی کردار میر عاشق، رشیدہ، محسن اور دیگر لوگ گفتگو میں منہمک رہے ہیں۔ نرگس (میر عاشق کی خانہ زاد) داخل ہوتی ہیں اور خبر دیتی ہے:

''حضور چھوٹے سرکار (میر ناصر) تشریف لائے ہیں''۔

میر ناصر اندر جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''سُنا ہے کہ انگریزوں نے پورے ہندوستان کو کرسٹان بنانے کی ٹھان لی ہے۔

کارتوسوں پر چربی لگائی ہے اور ہندوستانیوں کو اسے منہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ تلنگوں نے بغاوت کا ارادہ کرلیا ہے''۔ [۱]

میر عاشق اور میر ناصر میں گفتگو جاری ہے۔ میر ناصر کا کہنا ہے کہ انگریزوں کی دیسی سپاہ نے بغاوت کردی ہے اور وہ دہلی کی طرف بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

''ان باغیوں نے جھروکوں کے نیچے پہنچکر پرے جمائے اور باقاعدہ فوجی سلامی ادا کی۔ جہاں پناہ نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ استفسار حال کریں اور پوچھیں کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اس پر ان کے افسر آگے بڑھے اور ہاتھ جوڑ کر تقریر کی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں نے ان کے دین و آئین میں مداخلت شروع کردی ہے اس وجہ سے وہ بغاوت پر مجبور ہیں''۔ [۲]

''نقشِ آخر'' میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا پورا تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور خصوصاً مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تاخت و تاراج ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ نیز مسلمانوں میں قومی، سیاسی اور تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے بھی بعض اہم ڈرامے تخلیق کئے۔ انہوں نے مقصدی اور اصلاحی ڈراموں کے علاوہ تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ پروفیسر مجیب کے ڈراموں میں ''آزمائش'' قابلِ ذکر ہے۔

مجیب صاحب کا ڈرامہ آزادیِ ہند کے بعد یعنی جولائی ۱۹۵۷ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ اصلاً یہ ڈرامہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد ہندوستانیوں کی جنگِ آزادی اور حریب پسندوں کے عزم و حوصلے کا پتہ چلتا ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں قمر اعظم ''اُردو ڈرامہ نگاری'' میں لکھتے ہیں:

''اس میں انگریزوں کے خلاف عوام اور فوجیوں کی بغاوت اور شہزادہ مرزا مغل کی رہبری

---

[۱] ---

[۲] اشتیاق حسین قریشی ''نقشِ آخر'' ص ۲۳

نے وطن پرستانہ سرفروشی اور سرفروشانہ وطن پرستی کے سلسلے میں قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ یہاں عقائد وعزائم، شدت وقوت کے ساتھ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان سے اثر انگیز مکالموں کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور منزل ومقصد کے راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان ڈرامائی واقعوں اور مکالموں میں ڈراما نگاری کی صرف معلومات ہی نہیں محسوسات بھی ہیں''۔ ۱

آزمائش کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

مرزا مغل: ''کیوں کیا ہوا؟''

حکیم احسن اللہ خاں: ''کیا بتاؤں زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ فرنگیوں کی گستاخیاں کیا کم تھیں آج اپنے ملک کی بیبا کی دیکھ لی۔.....میرٹھ کی فوج نے غدر کر دیا۔ وہاں مار دھاڑ کر کے باغی آج یہاں پہنچے۔ حضور اقدس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے بادشاہ بن جائیں''۔ ۲

''آزمائش'' کا پورا پس منظر سیاسی ہے جس میں انگریزوں کے معاندانہ رویے اور عوام کے استحصال کے واضح نقوش ابھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراموں میں سیاسی، سماجی صورتحال کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ یہ ڈرامے اس دور کے قومی اور سیاسی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ چند ڈرامہ نگاروں نے بڑی جرأت اور بیبا کی کا ثبوت دیا اور ڈراموں میں واضح طور پر آزادی کا جذبہ اور مطالبہ پیش کیا۔

۱ قمر اعظم ''اردو ڈرامہ نگاری'' ص ۶۶

۲ پروفیسر محمد مجیب ''آزمائش'' ۱۹۵۷ء ص ۸

تحریک آزادی

اور

اُردو طنز و مزاح

تحریک آزادی اور اُردو طنز و مزاح

اُردو نثر میں طنز و مزاح کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ اس سلسلے میں غالب کے خطوط خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ غالب کے خطوط ہی نے اُردو نثر میں طنز و مزاح کی خشت اوّل رکھی۔ خطوط غالب کے بعد ''اودھ پنچ'' کے طنز و مزاح نگاروں نے اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اودھ پنچ کے قلم کاروں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی اور مختلف اسالیب کے ذریعے اس فن کو ارتقائی منزلوں تک پہنچایا۔

اودھ پنچ سے قبل ہجویات، شہر آشوب اور نظموں کی صورت میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ اودھ پنچ کا اجراء ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین نے طنز و مزاح کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار کیا تھا۔ اس کے قلم کاروں نے زندگی کے ہر شعبے اور ہر جہت مثلاً سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، اور تعلیمی مسائل اور معاملات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور کے حکمراں طبقے اور انگریزوں کی عملداری کو ہدف طنز بنایا۔

''نقوش'' لاہور جنوری، فروری ۱۹۵۹ء کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ:

''غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کے مراۃ العروس شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں ''اودھ پنچ'' جاری ہوا۔ اودھ پنچ مشرق اور مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے''۔[۱]

اودھ پنچ کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک و قوم کی خدمات ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آمادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے چینی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری

[۱] خورشید الاسلام ''طنز و ظرافت''، مستمولہ نقوش لاہور، طنز و مزاح نمبر، جنوری۔ فروری ۱۹۵۹ء ص ۱۸

تقاضوں کو پورا کیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصّہ لیا۔ اور ملک وقوم کی خدمت وتحفظ کے لئے متعدد سیاسی مضامین لکھے۔ منشی سجاد حسین بذاتِ خود کانگرسی ذہن رکھتے تھے اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپرد قلم کرتے رہتے تھے''۔ ۱

وزیر آغا ''اودھ پنچ'' کے عہد کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردّعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا انتہائی پستی اپنے جوبن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے۔ جب اسے آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آتا تو فرد کو ندامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش وانہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا کو کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی وبربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس دریا سے طنز وظرافت کے بے شمار چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر اس کی طغیانی میں دھیما پن پیدا کرنے کا قابلِ رشک کام سرانجام دیا''۔ ۲

مذکورہ بالا اقتباس میں اودھ پنچ کے عصری سیاسی مسائل کا پورا تناظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

وزیر آغا اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا

۱ رشید احمد صدیقی ص ۱۲۰

۲ وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز ومزاح'' ۱۹۵۸ء ص ۶۴۔۱۶۳

کے لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی حاجی بغلول، طرحدار لونڈوی، اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے جو خط ہندوستانی رؤسا کے نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں ''لوکل'' اور موافقت زمانہ'' کے زیرِ عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے ان میں ملک کے سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے''۔ [1]

سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپردِ قلم کئے نیز ان مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل سے بھی بحث کی۔ سجاد حسین کے مضامین میں ''انڈے بچّے والی چیل چلہاڑ'' عوام و خواص میں از حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ کھلے خطہ سربستہ مضامین نیچر کا مارشل لاء، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں، جھنجھٹ کا یہ مزہ ہے، کہ ہوں وہ بھی بے قرار، پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹکل اقلیدس، بے مار کی توبہ، ٹیکس کی رم، ابر کامل اور سرکار انگلشیہ، منھ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے، پولیٹکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش، قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور آخر تک کانگریس کے علمبردار رہے۔ اس لئے انہوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لئے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ یہ مضامین طنز و مزاح کے پردے میں پیش کئے گئے تھے اس لئے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزاء کا پہلو بھی برقرار رہا۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ منشی سجاد حسین کا مضمون ''انڈے بچے والی چیل چلہاڑ'' اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جن انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جارہے تھے۔ اور کانگریس کی مخالفت میں ''انٹی کانگریس'' کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔

[1] وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' ۱۹۵۸ء ص ۱۶۴

لہذا سجاد حسین ''انٹی کانگریس'' کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموہی منھ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں''۔ [۱]

سجاد حسین طنز و مزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے بحیثیت مدیر ''اودھ پنچ'' مختلف اوقات میں مختلف افسرانِ بالا کو تحریر کئے تھے، خط کا ایک حصّہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

''صاحب من! جب کسی قسم کی کاروائی کا مصمم ارادہ کرلیا جائے اور کچھ لحاظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع افہام و تفہیم، گنجائش، پند و وعظ اس طرح غائب ہے جیسے برہمایا ہندوستان مگر دنیا کا کوئی حل بے نتیجے رہ نہیں سکتا۔ آج نہیں کل، یہاں نہیں وہاں، ضرور بالضرور، کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے ممکن کیا یقین سہی کہ تم نے آہ و نالے کی طرف سے کانوں میں انگلیاں بڑے زور سے ٹھونس لیں، حالت خستہ کی طرف سے آنکھ پھیر لی''۔ [۲]

منشی سجاد حسین اپنے خطوط میں طنز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو یقیناً طنز سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو خطوط انگریز افسروں کو لکھے ہیں، ان میں بھی تیر و نشتر سے کام لیکر اپنی بات کہی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لارڈ رنڈ الف چرچل جو بدقسمتیٔ ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں، بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے۔ معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم کی دست برد سے اعزاز قیصری سے محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے''۔ [۳]

[۱] اودھ پنچ جلد سوم شمارہ ۳۔ نومبر ۱۸۹۹ء ص ۸ [۲] وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' ص ۲۲۹

[۳] کشن پرشاد کول ''اودھ پنچ کی نوبت'' منقول ادبی اور قومی تذکرے ۱۹۵۵ء ص ؟؟؟؟

منشی سجاد حسین کے اس طرح کے متعدد خطوط ملتے ہیں جن میں طنز و مزاح کے پیرایۂ بیان میں حکامِ بالا کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے یا پھر ان کے دانستہ طور پر اپنائے گئے بے جا رویّے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برقؔ ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برقؔ کو اُردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرساد برق کے بیشتر تراجم ملتے ہیں۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے۔ ان کا ایک مضمون ''البرٹ بل'' بطور خاص قابل توجہ ہے۔ اس مضمون کا ایک فکاہیہ نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

''.....اختیار ملا مگر برائے نام مگر ہمّت نہ ہارنا چاہئیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو، دشمنوں سے سبق لو، کچھ کھو چکے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اگر تم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگریز پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا مگر شر ہمارا شیوہ نہیں ہم تو سچّے خیر خواہِ سرکار ہیں۔ مگر ہائے رے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی، کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر کنسکاڈٹ کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا''۔ [1]

طنز و مزاح نگاروں میں نواب سیّد محمود آزاد کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے تحریفات کے انداز میں ایک ''ڈکشنری'' بھی تحریر کی تھی جس میں انہوں نے ظریفانہ پیرائے میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں۔ چند اقتباس ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں:

''پولیسی (حکمت عملی)''....ممبران پارلیمنٹ کے آپس کا ناز و نیاز کمزور کو دبانا زبردست

[1] کشن پرشاد کول ''اودھ پنچ کے نورتن'' منقول از ادی اور قومی تذکرے جلد دوم ۱۹۵۵ء ص ۲۳

سے ڈرنا..... مار کے آگے بھاگتے کے پیچھے جانا۔ کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا، پارٹی فیلنگ (پاسداری جماعت) مرغ بے ہنگام کی طرف چلّانا۔ غور بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قسموں کو راہ راست سے بہکانا، بے ہودہ شکایت، ناجائز تہمت، وزارت کے کھونے کا صدمہ، جگر گداز، کوئی سُنے نہ سُنے اپنی کہے جانا.....''

''پارلیمنٹ (جلسہ مدیران ملکی) مدیروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تماشہ دکھانے کا تھیٹر، باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور، انصاف آموزی کا وہ اسکول جہاں روسیوں کے ظلم ناحق کے انسداد کی کوئی عمدہ سبیل نہیں''۔

''یورپین کنسرٹ (یورپ کے سلاطین کا اتفاق) تمدن کی آراستہ فوج، دنیا کی آزادی کا ضامن، مشرقی مسئلوں کے حل کرنے کی کھرل، کمزور کو زور آور اور زور آور کو کمزور بنانے والی ولایتی کل، کمزور سلطنتوں کے لئے بٹوارے کا نیا قانون.....''۔ [1]

سید محمود آزاد کے مضامین میں ''روداد، اجلاس جنجال کونسل، اور گرما گرم تار کی خبریں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔

اس دور کے اخبارات میں ''الپنچ'' بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ اخبار پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ اس اخبار نے اس دور کے عصری سیاسی اور سماجی مسائل اور ہنگاموں سے بحث کی ہے۔ الپنچ'' میں ''سوال از آسمان و جواب از سیمان'' کے عنوان کے تحت انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں:

سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں، اور انگریز دن میں کتنی دفعہ اور کون کون سے وقت کھاتے ہیں؟

جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بیچاروں کو میسر ہی

[1] کشن پرشاد کول ''اودھ پنچ کے نورتن'' منقول از ادی اور قومی تذکرے جلد اول ۱۹۵۵ء ص ۲۳۰

نہیں۔اور غریب بیچارے کبھی دو دن اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں۔انگریز دن میں پانچ مرتبہ.....

سوال: انگریزی کھانوں میں پڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: پڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان سے گیہوں روپے من کے حساب سے خرید کر انگلینڈ چلان ہوتا ہے وہاں اس کا مائدہ بنتا ہے اور وہاں سے روپے سیر کے حساب سے یہاں روانہ کیا جاتا ہے۔اس مائدہ میں گھی، دودھ اور چینی ملا آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔جب تیار ہو جاتا ہے تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں.....''۔ [۱]

ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔

سوال: خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لئے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں، جب چاہے قید کیجئے اور جب چاہے پھانسی دیجئے۔مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیت دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پروا نہیں۔

سوال: سزائے حبس دوام بعبور (کذا) دریائے شور کن مجرموں کے لئے مقرر کی گئی ہے؟

جواب: پہلے تو یہ سزا صرف دو تین مجرموں کے لئے تھی مگر دو جرم اس میں اور بڑھائے گئے ہیں۔ایک تو کسی انگریز کے مقابلے کے ساتھ باتیں کرنی، دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر نکتہ چینی کرنی''۔ [۲]

مذکورہ بالا سطور میں چند اقتباسات ''اپنچ'' کے تحریک کئے گئے جو انگریزوں حاکموں کے سفاکانہ رویّے کے خلاف تھے۔

اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح کا عبوری دور شروع ہوتا ہے۔اس دور کے مزاح نگاروں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتحپوری، سجاد یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد۔محمد علی

[۱] عبدالرزاق قریشی ''نوائے آزادی'' ۱۹۵۷ء ص ۵۶۔۵۵

[۲] عبدالرزاق قریشی ''نوائے آزادی'' ۱۹۵۷ء ص ۵۶

جوہر، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، ملاّ رموزی، وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

معین عقیل عبوری دور کے قلم کاروں کے سیاسی رجحانات اور اصابت فکر کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں:

''محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ملا رموزی، ایسے صاحب قلم ہیں جنہوں نے اپنی ظریفانہ تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی سیاسیات اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاسی ہلچل اور مسائل کی عکاس ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی تحریروں کا مقصد محض اپنی قوم کے کردار کی اصلاح تک ہی محدود رکھا''۔ [۱]

میر محفوظ علی نے سیاسی مباحث پر متعدد مضامین لکھے ان کے مضامین میں ''انجمن تجاہل عامیانہ کا غیر معمولی جلسہ''۔ ''کارروائی جلسہ''۔ حاجی صاحب کی تقریر اور کاروائی جلسہ''۔ ''حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر''۔ بلبلانِ اسیر کی رہائی''۔ ''مسٹر صاحب دین'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ میر محفوظ علی برادران کی جیل سے رہائی پر اپنے ایک مضمون ''بلبلان اسیر کی رہائی'' میں لکھتے ہیں:

بچہ: ابا جان یہ کیا کام کرتے ہیں؟

باپ: اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔

بچّہ: تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سلف لا دیتے ہیں؟

باپ: ہماری محبت تو انہیں ایسی ہے کہ اس کے لئے بھی تیار ہیں لیکن اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں۔

بچہ: تو کیا یہ بوجھ اُٹھاتے ہیں؟

باپ: (آنکھوں میں آنسو آ گئے) حقیقت میں یہ بڑے بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں''۔ [۲]

[۱] معین عقیل ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۶۰۹

[۲] [illegible]

طنز ومزاح کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، سیاست دان، اعلیٰ پائے کے صحافی اور طنز مزاح نگار تھے۔ طنز ومزاح کے ضمن میں ''الہلال'' کا شذرہ ''افکار وحوادث'' قابلِ ذکر ہے اس میں مولانا کی طنزیہ ومزاحیہ تحریریں ہوتی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں انگریزوں کو ہدف طنز بنایا گیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کا نام ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ وہ محبّ وطن تھے۔ انہوں نے لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں انگریزوں سے کہا تھا ''میں یہاں سے آزادی کا وثیقہ لیکر جاؤں گا یا پھر یہیں پر اپنی جان دے دوں گا''۔ بالآخر مولانا محمد علی جوہر کی وفات لندن میں ہوئی اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان قربان کردی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اسی مقصد کے تحت اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا۔ یہ ایک اہم سیاسی اخبار تھا۔ ''ہمدرد'' میں انہوں نے متعدد سیاسی مضامین لکھے اور ایسے وقت میں قلم اٹھایا جب ملک میں بہت سے سیاسی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ سیاسی طور پر ہندوستان کے حالات منتشر تھے مولانا محمد علی جوہر نے اپنے قلم اور خیالات کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت انجام دی۔ ان کا ایک مضمون ''سائمن کمیشن اور ہندوستان'' کے عنوان سے ''ہمدرد'' کے ۲۹ر جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''حسرت صاحب (مولانا حسرت موہانی) چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاک خانہ بنایا جائے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک جسے حسرت صاحب اس کمیشن کے منھ پر پھینکنے کے لئے ہم سے کہتے ہیں ہم ایک پوسٹ کارڈ ڈاک خانے میں ڈال دیں، جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے، یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ر فروری کی ہڑتال ہوگی''۔[۱]

اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان میں کمیشن کی آمد کی کھل کر مخالفت کی تھی نیز حکومت

[۱] مولانا محمد علی جوہر ''ہمدرد'' بحوالہ افاداتِ محمد علی ۲۹ر جنوری ۱۹۲۸ء

پر طنز کئے تھے۔ رقمطراز ہیں:

''اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں کمیشن ہرگز قبول نہ ہوتا اس لئے کہ اگر چہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخر فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا بلکہ ہندو مسلمان دونوں بیویاں بن جاتے اور سوکنوں اور بیرنوں کی طرح لڑتے اور فیصلہ میاں کرتے اگر ہم دونوں اتحاد و اتفاق بھی کر لیتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا۔ وہی عربوں کی مثل صادق آتی ہے کہ ''ہر کام گھر والی سے مشورہ ضرور کر لیا کرو مگر کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو''۔ ۱

اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں ملّا رموزی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ مُلّا رموزی کی نثر بڑی تنوّع ہے۔ انہوں نے سیاست، مذہب، تہذب وتمدن، اخلاق ومعاشرت اور ادب وقومیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ ان کے طنز ومزاح کا بیشتر حصّہ سیاست پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین میں سیاسی واقعات اور سانحات کی طرف اشارے جگہ جگہ مل جاتے ہیں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''اے انگریزی تیل سر میں ڈالنے والو! خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمہارے ان ایڈیٹروں اخبار اُردو کے کہ یہیں جواب دیتے وہ مبلغ ایک برس تک نامہ نگاروں اور خریداروں اپنے کو ساتھ بہانہ مصروفیتوں اپنی کے، اور لائڈ حارج وفد مسٹر محمد علی کو ساتھ تعصب اور گھمنڈ قوت حکومت اپنی کے اگر چہ دم پیچ ناک کے کر دیا جماعت سن فیل نے فوجوں برطانیہ کا وغیرہ وغیرہ''۔ ۲

طنز ومزاح کا عبوری دور ختم ہو جانے کے بعد جدید طنز ومزاح کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں رجحانات میں تبدیلیاں آئیں اور سیاسی صورت حال نے بھی نیا موڑ لیا۔ اس دور کے طنز ومزاح نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، عبد المجید سالک، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج، میاں عبد العزیز فلک پیما، کنہیا لال کپور، احمد شاہ بخاری پطرس، عظیم

۱ رئیس احمد جعفری ''افادات محمد علی'' ص ۱۳۳

۲ [illegible]

بیگ چغتائی، کرشن چندر، شوکت تھانوی، حاجی لق لق، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔

ان مزاح نگاروں میں صرف انہیں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جن کے یہاں سیاسی اعتبار سے طنز و مزاح کے پہلو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں عظمت اللہ خاں کی تحریروں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں ایک سنجیدہ طنز و مزاح نگار ہیں وہ بڑی عمدگی اور شگفتگی سے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے مضامین بڑے دلچسپ اور سنجیدہ ہوتے ہیں جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے مطالعہ میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرح کے مضامین میں ''گڑیا خانہ''۔ ''ڈیڑھ اینٹ'' خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان مضامین میں اس دور کے سیاسی مسائل پر خاطر خواہ بحث مل جاتی ہے۔ مضمون ''ڈیڑھ اینٹ'' میں لکھتے ہیں۔

''غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلّط کر دیا، امن کا دور دورہ ہوا۔ لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیرات ہند مرتب کیا اور دوسری طرف علم مغرب کی گنگا بہائی''۔ [۱]

اس مضمون کا ایک اور اقتباس جس میں سنجیدگی کے ساتھ طنز کا پہلو ملتا ہے، ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

''مشہور ہے کہ کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ آپ کو ہندوستان کا کونسا میوہ بھایا؟ تو اس ستم ظریف نے ساری ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی تحقیقات بھر دی۔ اس نے ہنس کر صرف یہ کہا ''پھوٹ''۔ [۲]

مضمون ''گڑیا خانہ'' میں لکھتے ہیں:

''اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادرِ وطن اور سوراج کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل جانا

[۱] اردو ادب میں طنز و ظرافت ''منقول از نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر ص ۱۶۶

[۲] اردو ادب میں طنز و ظرافت ''منقول از نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر ص ۱۸۱

فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے؟ برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے''۔ [۱]

میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام طنز و مزاح کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی نثر شگفتہ، لہجہ نشین متین اور سنجیدہ ہے۔ فلک پیما کے مضامین میں عصری سیاسی مسائل اور عوام کی جدو جہد آزادی سے بحث ملتی ہے۔ ان کے اس قسم کے مضامین میں ''شملے کی سڑکیں''۔ ''عدالتیں''۔ اور ''شیطان اور بزرگ'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مضمون ''شملے کی سڑکیں'' میں لکھتے ہیں:

''شملے کی سڑکیں لاکھ سر پٹخیں، حکومت کی مغرور و رکشا کے لئے آٹھ نہیں آٹھ کروڑ ننگے پاؤں موجود ہیں.....''۔ [۲]

فلک پیما مختلف کرداروں کی زبان سے اپنی بڑی عمدگی کے ساتھ طنز کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مضمون ''عدالتیں'' میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

چلو پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور فاقے خاں

چلو لالہ گروی مل اور مرہون الٰہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد شروع ہوا تھا اور شاید قیامت تک رہے''۔ [۳]

مضمون ''شیطان اور بزرگ'' میں لکھتے ہیں:

''.....جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش

۱ کلیم الدین احمد ''اُردو ادب میں طنز و مزاح نمبر'' نقوش لاہور ص ۲۲۵ ۲ عبدالعزیز فلک پیما ''مضامین فلک پیما'' ص ۱۲۹
۳ عبدالعزیز فلک پیما ''مضامین فلک پیما'' ص ۱۷۸

آئے اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگریسی یا مہا سبھائی لڈر سے شیطان کا تعارف کرائے، شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوئی''۔ [۱]

فلک پیما نے اپنے مضمون میں ''فرانس اور ہندوستان'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کوئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال کھیلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس ذلّت سے نہ بچ سکے.....آج کل انگریز بیچارے تختہ مشق ہیں.....اصل منشاء یہی ہے کہ جب باری باری ''سب قومیں ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شہنشاہی کرنے لگے''۔ [۲]

اقتباس بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فلک پیما نے اپنے مضامین میں انگریزوں کا تمسخر اڑایا ہے اور ان کی بداعمالیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اُردو طنز و مزاح میں چراغ حسن حسرت کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حسرت جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے بیشتر فکاہیہ کالم لکھے۔ اس دور کی سیاسی صورتحال، ہنگامی واقعات اور دیگر مسائل سے بحث کی ہے۔ پنجاب کی چند سیاسی شخصیتوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اور چند انگریز پرست سیاست دانوں کا تمسخر اڑایا ہے۔ اپنی کتاب ''پنجاب کا جغرافیہ'' میں لکھتے ہیں:

کانگریسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگریس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانے میں بہہ نکلی تھی یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا بھی پانی آتا ہے۔ بہرحال یہ برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

---

[۱] عبدالعزیز فلک پیما ''مضامین فلک پیما'' ص ۲۶۱

[۲] عبدالعزیز فلک پیما ''مضامین فلک پیما'' ص ۲۱۱

دریائے کالی

ہندومہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے ''کالی ناگ'' کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا ہے اور ہندومہا سبھا کی ترائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے.....کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندومہا سبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ دریا کس علاقے کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دُھن بدیسی ہے اس کا طاس جسے ٹریبیوں کہتے ہیں ''بہت زرخیز ہے''۔ [1]

جہاں تک شوکت تھانوی کی مزاح کا تعلق ہے وہ بڑے زودنویس قسم کے مزاح نگار تھے۔''سودیشی ریل'' اور ''لکھنؤ کانگریس سیشن'' ان دونوں تحریروں میں انہوں نے اس دور کی سیاسی تحریکوں کو اُجاگر کیا ہے۔سودیشی ریل میں لکھتے ہیں:

''دیکھتے ہیں کیا کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا، بندے ماترم کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ہم نے لوگوں سے پوچھا بھائی یہ کیا ہے؟

جواب ملا کہ کیا سور ہے تھے؟

خبر نہیں کہ سوراج مل گیا ہے''.....

اور ایک آزاد اور خودمختار سانس لیکر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ہے.....'' [2]

''لکھنؤ کانگریس سیشن'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایجنڈے میں اب آزادیِ کامل کی تجویز تھی امید تھی کہ اس پر زبردست مباحصہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ یہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہوگئی مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کون سی جماعت لائے۔

[1] بحوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۶۱۹

[2] بحوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۶۲۰

نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا

حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں۔

شہزادگان نے کہا۔ ''نہیں پہلے آپ''

نواب زادگان نے کہا۔ ''پہلے آپ''

شہزادوں نے کہا۔ واللہ یہ نہ ہوگا۔

پہلے آپ، آخر اس پہلے آپ اور نہیں۔

حضرت اس پہلے آپ ہی میں صبح ہوگئی اور اجلاس ختم ہوگیا''۔ ۱

کنہیالال کپور نے معاشرے میں پھیلے ہوئے سیاسی انتشار، بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ سیاسی عمائدین اور زعماء کی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آپ نے سیاست کی باقاعدہ تعلیم کہاں حاصل کی؟ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی، مسٹر چرچل اور جوزف اسٹالین سے کیوں افضل سمجھتے ہیں؟

آپ جیل خانے سے کیوں ڈرتے ہیں؟ ۲

ایک اور جگہ گاندھی جی کی قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

''کمال کر دیا مہاتما جی نے!

پورے تین ہفتہ کچھ نہیں کھایا

روحانی طاقت ہے۔

اوتار ہیں''۔

میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ مہاتما جی کبھی مر نہیں سکتے''۔

ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا

۱ بحوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۶۲۱

۲ کنہیالال کپور ''[illegible]

میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت

یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے تمام بزدلوں کو گولی ماردی جائے

ہاں

تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا''۔ ۱؎

رشید احمد صدیقی کا نام اُردو دنیا میں بحیثیت طنز و مزاح نگار بڑی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں طنز وظرافت کے پس پشت چند اصلاحی مقاصد بھی نظر آتے ہیں جو تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑے اہم اور ضروری تصور کئے جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ وہ معمولی بات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر طنز کا پہلو مقصدیت کے تحت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان تحریروں کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

''عُشّاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے اس لیے نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیراتِ ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی آوردہ ہیں۔ عشّاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہیں''۔

''انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا۔ عشّاق کو شعراء نے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعراء اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ سوراج مل جائے۔ انگریزوں میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے''۔ ۲؎

ہر ہندوستانی کے دو پیدائشی حق ہیں۔ ایک بلوغ اور دوسرا سوراج''۔ ۳؎

نان کوآپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک کیفیت دماغی ہے اور ممکن ہے یہی سب ہو کہ کوآپریشن اور مغالطہ اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف کے متحمل نہ ہو سکے''۔

۱؎ کنہیالال کپور ''شیشہ و تیشہ'' ص ۲۴۔۲۳ ۲؎ رشید احمد صدیقی ''مضامین رشید'' ص ۲۵۳

۳؎ رشید احمد صدیقی ''مضامین رشید'' ص ۲۴۹

اُردو نثر میں طنز و مزاح، تحریف اور فکاہیہ مضامین کا جو سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع ہوا تھا ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے اسے باضابطہ فن کی حیثیت دی۔ اخبار ''اودھ پنچ'' نے اس کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ کنہیا لال کپور اور رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم فنکاروں نے اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُردو طنز و مزاح نگاروں نے اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ عوام کو غلامی کا احساس دلایا اور آزادیِ ہند کی تحریکوں کے فروغ میں بھرپور حصّہ لیا۔

تحریکِ آزادی

اور

اُردو خودنوشت وسوانح

تحریکِ آزادی اور اُردو خودنوشت وسوانح

ایک فرد اپنی زندگی کا طویل سفر کرنے کے بعد جب عمر طبعی کو پہنچتا ہے تو اسے اپنی گذشتہ زندگی کے حالات وکوائف، جن سے وہ دوچار ہے، ضبطِ تحریر میں لانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح گذشتہ زندگی کے طویل عرصہ کو محیط جب فرد اپنی زندگی کے مکمل طور پر قلم بند کر لیتا ہے تو اس تحریر کو ہم خودنوشت سوانح عمری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

خودنوشت سوانح عمریاں مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وغیرہ۔ خودنوشت میں چونکہ فرد اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات وتجربات اور رجحانات ومیلانات اور ماحول وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اس لئے وہ دراصل تاریخ ہوتی ہے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور پورے معاشرے کی خود نوشت زیادہ اہم ہوتی ہے بہ نسبت سوانح عمری کے۔ کیونکہ خودنوشت کو فرد خود قلم بند کرتا ہے، جب کہ سوانح عمری میں ایسا نہیں ہوتا۔

اُردو ادب میں سیاسی، وسماجی خودنوشت سوانح عمری کے نمونے انیسویں صدی کے ربع آخر میں مل جاتے ہیں۔ سیاسی خودنوشت سے مراد ان خودنوشت سوانح عمریوں سے ہے جنہیں یا تو کسی سیاسی یا سماجی شخصیت نے قلم بند کیا ہو یا ان میں سیاسی وسماجی مسائل زیرِ بحث آئے ہوں۔ سیاسی خودنوشت سوانح نگار اپنے مقصد سے شدید ذہنی وجذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور ہر چند اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے نیز اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس لئے یہ ذہنی وجذباتی وابستگی اور تبلیغ اس کو جانبداری میں مبتلا کر دیتی ہے جس کے سبب وہ ہر واقعہ کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے مصنف کے حالاتِ زندگی تو صرف ایک زیب داستان کے طور پر بیان ہوتے ہیں۔ اصل میں اس کی خودنوشت کا نقطۂ نگاہ کوئی تحریک یا سیاسی نظریات ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ عوام تک پہنچاتا ہے۔ سیاسی وسماجی خودنوشت سوانح عمریوں میں تاریخی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے

کیونکہ خودنوشت کا مصنف براہِ راست یا بلا واسطہ طور پر کسی تحریک یا کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے۔اس لئے اس کے بیانات سیاسی ہوتے ہوئے بھی کافی وقیع ہوتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی وسماجی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک ہی تحریک یا واقعہ مختلف اور متضاد شکل میں نظر آتا ہے۔اس کا سبب یہ بھی ہے کہ مختلف اشخاص ایک ہی واقعہ کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں یا واقعات کے کسی خاص پہلو کو اُجاگر کرنے میں اپنی توجہ صرف کر دیتے ہیں۔اس طرح سیاسی یا سماجی خودنوشتیں تاریخی عنصر کی فراوانی کے باوجود تاریخ کا نعم البدل نہیں ہیں۔البتہ تاریخ کے لئے مواد ضرور فراہم کرتی ہیں۔سیاسی وسماجی خودنوشت سوانح عمریاں بیشتر خارجی واقعات اور حادثات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ان میں جذبات کی عکاسی بہت کم ہوتی ہے یہی وہ عنصر ہے جسکی بدولت سیاسی وسماجی خودنوشت کا کینوس بیشتر سیاسی تحریکات اشخاص وافکار پر مبنی ہوتا ہے۔

اس بات میں شامل خودنوشت سوانح عمریوں کے نام اس طرح ہیں۔''تواریخ عجیب موسوم بہ کالا پانی'' جعفر تھانیسری۔''داستانِ غدر'' ظہیر دہلوی۔''اعمال نامہ'' رضا علی۔''میرا افسانہ'' چودھری افضل حق۔''یادِ ایّام'' نواب احمد سعید خاں چھتاری،''سرگذشت'' عبدالمجید سالک بٹالوی،''لطیف کی کہانی'' عبداللطیف بٹالوی۔''تلاشِ حق'' مہاتما گاندھی مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔''اپنی کہانی'' ڈاکٹر راجندر پرشاد مترجمہ گوپی ناتھ امن۔''نقشِ حیات'' مولانا حسین احمد مدنی۔''میری کہانی'' جواہر لال نہرو اہم ہیں۔

مذکورہ خودنوشت سوانح عمریوں کو سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے جعفر تھانیسری نے اپنے ایّامِ اسیری کے زمانے میں''تواریخ عجیب موسوم بہ کالا پانی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔اس خودنوشت میں انہوں نے وہابی تحریک کا تذکرہ کیا ہے اور اس تحریک کے سرگرم کارکنوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے نیز انگریزوں کے مظالم کی روداد بھی بیان کی ہے۔اس میں آزادی کی جدوجہد اور احیائے دین بیک وقت دونوں سے بحث مل جاتی ہے۔جعفر تھانیسری

''تواریخ عجیب'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے علم ہے اس مقدمہ (انبالہ) میں ہم لوگوں کی گرفتاری بھی منشائے ایزدی اور اس آیت کی فقط سچ اور جھوٹ کی پرکھ اور آزمائش کے واسطے تھی ورنہ وعدۂ حق موجودہ "وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" پس اگر یہ سبب آزمائش کا نہ ہوتا تو کبھی بھی سرکار انگریزی کے ہاتھوں ہمیں صدمہ نہ پہنچتا۔....

بس یہ کتاب گویا آیت مذکورہ کی تفسیر سمجھنی چاہیئے''۔

جعفر تھانیسری نے اس خودنوشت میں اپنے انبالہ کے مقدمہ اور قید فرنگ کے بیس برس کے حالات وکوائف کو قلم بند کیا ہے۔ نیز اپنی زندگی کے مذہبی اور سیاسی حالات کو بھی مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور خصوصاً وہابیوں کی تحاریک کی مقبولیت، محنت کش اور زبوں حال عوام کی داستان تحریر کی گئی ہے۔

ایک اہم خودنوشت سوانح عمری ''داستانِ غدر'' ہے۔ اس کے اُردو کی اوّلین خودنوشت تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف ظہیر دہلوی تھے۔ ظہیر دہلوی کی وابستگی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے رہی۔ اس لئے یہ کتاب اس دور کی سیاسی کشمکش، امراء وسلاطین کی سراسیمگی کی آنکھوں دیکھی تصویر پیش کرتی ہے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے حالات، تہذیبی اور ثقافتی منظر میں بیان کئے ہیں۔ اس خودنوشت میں انقلاب ۱۸۵۷ء زیادہ نمایاں ہے اور ان کے زندگی کے حالات پس پشت نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ میر امن سے عبدالحق تک میں'' رقمطراز ہیں:

''داستانِ وقائع عذر میں آپ بیتی کا حصّہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی ہوا اس میں مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی معلومات افزا اور سبق آموز داستان ملتی ہے خصوصاً دہلی

اور قلعۂ مُعلّی کی معاشرت کے دلچسپ نقشے نظر سے گذرے ہیں''۔ [۱]

غدر ۱۸۵۷ء میں جو حالات وقوع پذیر ہوئے ظہیر دہلوی نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بجنسہٖ ان واقعات کا حال بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس قیامت صغریٰ سے ان کے خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے خسر اور چچا انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوئے اور انھیں بھی جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ وہ دربدری اور خانہ بدوشی کی داستان قلعہ معلّٰی کی رسمی رونق سے شروع کرتے ہوئے انگریزوں کے مظالم اور یورپیوں کے مظالم پر ختم کر دیتے ہیں۔ ظہیر دہلوی نے انگریزوں کے مظالم کی ہولناک داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مولا بخش ہاتھی کو سانڈرس کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے یہ ہاتھی بھی باغی نظر آیا۔ ہاتھی کا باغی ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر آزادی پسند اور حریّت پسند انسان انگریزوں کو باغی نظر آتا تھا بلکہ غلامی کے اثرات جانوروں نے بھی قبول کئے تھے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب میں بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب سے بے تعلق ظاہر کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ جب بادشاہ کے پاس میرٹھ کے باغی فوجی کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے کہا:

''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں گا۔ فوج نہیں کہ تمہاری مدد کروں گا۔ ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان ہو کر انگریزوں سے صلح صفائی کرا سکتا ہوں''۔ [۲]

بہر حال ''داستان غدر'' کی قدر و قیمت اور تاریخی اہمیت سے اُردو کا کوئی بھی ذی شعور ادیب انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اُردو کی ابتدائی خودنوشتوں میں سے ہے جو اپنے اسلوب بیان اور تاریخی و سیاسی واقعات کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

---

[۱] سید عبداللہ ''میرا من سے عبدالحق تک'' ۱۹۶۵ء ص ۸۳

[۲] ظہیر دہلوی ''داستان غدر'' ص ۲۴

اس سلسلے کی ایک اور اہم خودنوشت ''اعمال نامہ'' ہے۔ اس خودنوشت کو سر رضا علی نے تصنیف کیا تھا گ جس کو اُردو کی ایک مکمل اور مستند خودنوشت کہا جا سکتا ہے۔ ''اعمال نامہ'' کا مطالعہ کرنے کے بعد اس عہد کی سیاسی تنظیموں اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''اعمال نامہ'' میں پیش کردہ سیاسی حالات اور ادبی مباحث پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو سیاست سے جس قدر لگاؤ تھا اسی قدر وہ ادب کا بھی دلدادہ تھا۔ سیاسی بصیرت اور ادبی ذوق کا حسن امتزاج ''اعمال نامہ'' کو دوسری خودنوشتوں سے ممیّز اور ممتاز بنا دیتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی ایک اہم جماعت ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' تھی۔ اس کانفرنس میں سر رضا علی نے سیاسی سطح پر بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس کانفرنس کا ایک اجلاس بنگال میں ہونا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہار اور بنگال کو ایک مرکز پر لانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو انہیں یہ احساس ہوا کہ اس کے پس پردہ کہیں حکومت اور لیفٹننٹ گورنر کا ہاتھ تو نہیں ہے اور اس انجمن کے ذریعے مسلمانوں کو قعر گمراہی میں تو نہیں ڈالنا چاہتے۔ لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ لیگ قائم کرنے سے بانیان لیگ کی غرض گورنمنٹ کو امداد دینا یا کانفرنس کی مخالفت کرنا نہیں تھی بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جن کو ایک طرف گورنمنٹ اور دوسری طرف کانگریس پامال کر رہی تھی کما حقہٗ مخالفت کی جائے''۔ [۱]

سر رضا علی نے ۱۹۱۱ء کی ہندو مسلم کانفرنس کا تذکرہ کیا ہے جس میں اُردو ہندی، انتخاب کے مسائل زیر غور آئے تھے۔ اس کتاب میں مچھلی شہر کانپور کا مسئلہ اور اس کے سیاسی نیز مذہبی پہلوؤں پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے سفاکانہ مظالم کا بیان مفصل طور پر کیا گیا ہے۔ سر رضا علی کی خودنوشت گذشتہ پچاس سالہ ہندوستانی معاشرت اور سیاست پر محیط ہے۔

[۱] سر رضا علی ''اعمال نامہ'' ص ۱۱۱

''میرا افسانہ'' چودھری افضل حق کی تصنیف کردہ خودنوشت ہے۔اس کا زیادہ حصّہ سیاسی ہے لیکن اس میں کہیں کہیں مذہبی رنگ بھی ملتا ہے۔مصنف کی پوری توجہ ملک کے سیاسی اور قومی کردار پر مرتکز نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بہت ہنگامہ خیز تصوّر کی جاتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں چوھری افضل حق کا تقرر سب انسپکٹر پولیس کی حیثیت سے لدھیانہ میں ہوا تو انہیں ہنگامہ خیز حالات سے دوچار ہونا پڑا۔انہوں نے اس دور کے مختلف حالات کو اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔ پولیس افسران کے ناروا مظالم اور معاندانہ رویّوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک پولس انسپکٹر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''غلام ہندوستان میں سب انسپکٹر پولس بھوکا بھیڑیا ہے۔ جدھر منہ اٹھایا لوگوں کو چیرتا پھاڑتا چلا جاتا ہے۔ سرکار کے ملازمین کے ہاتھوں انسانیت کی ایسی تذلیل شاید ہی کہیں ہوتی ہو''۔[۱]

اس کی خودنوشت کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور انگریزوں کے ظلم واستبداد کا پتہ چلتا ہے۔ چودھری افضل حق محبّ وطن تھے۔ان کے دل میں محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ملک وقوم کی خدمت کی غرض سے انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنا شروع کردی۔ گاؤں گاؤں جا کر تقریریں کیں۔عوام کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریز عملداری کے خلاف اکسانے میں اہم رول ادا کیا۔ نتیجہ کے طور پر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔طرح طرح سے ایذا پہنچائی گئی جس کا بیان مندرجہ ذیل الفاظ میں اس طرح کیا گیا:

''غرض بابر کا ہندوستان دلچسپی سے خالی ہورہا تھا اور قید خانوں کی کشش بڑھ رہی تھی۔ دو برس کی مسلسل دعوت اسیری وخواہش پابندی کے باوجود میں ابھی آزاد تھا اس لئے دل مغموم اور نا

[۱] چودھری افضل حق ''میرا افسانہ'' ص ۴۷

شادتھا۔اپنی شکستہ پائی پرافسوس اورہم سفروں کے منزل مقصودتک رسائی پررشک آتا تھا۔دل درد مندکی زادی پرواز پیدا کیااور یک بیک دراجابت کھلا''۔[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت چودھری صاحب گرفتار ہوئے اس وقت تک ہندوستان کے بیشتر حرّیت پسندحیلوں کواپنا مسکن بنا چکے تھے۔مصنّف کی گرفتاری،جیل کے تلخ تجربات،انگریز نما ہندوستانیوں کے سفاکانہ رویئے اس خودنوشت کے نصف سے زیادہ حصّے پر چھائے ہوئے ہیں۔بلکہ اس کتاب کا اختتام بھی جیل ہی کے ایک عجیب واقعہ کے عنوان کے تحت ہوتا ہے۔جس جیل میں چودھری صاحب کورکھا گیا تھا اتفاق سے اسی جیل میں سردار بھگت سنگھ بھی تھے۔بھگت سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میری تقریروترغیب کی بناء پرتحریکِ آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ان کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جیل میں سیاسی قیدیوں کے دوگروہ تھے۔ایک گاندھی جی کے''اہنسا'' پرگامزن تھا اور دوسرا حسرت موہانی کا ماننے والا۔

چودھری افضل کی خودنوشت''اعمال نامہ'' سیاسی ہونے کے باوجودزبان واسلوب کے اعتبار سےادبیت کی حامل ہے۔اسی کے ساتھ اپنے عہد کے سیاسی حالات اورحریت پسندوں کے جذبات کی مؤثر عکاسی کرتی ہے۔

نواب احمد سعید خاں چھتاری نے''یادِایّام'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت تحریر کی تھی۔ ''یادِایّام'' سیاسی خودنوشتوں میں ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔یہ نواب صاحب کی شخصیت اور ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔اس میں انہوں نے انگریز حاکموں کی رعونت اورانسان ناشناسی کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔اس کے دوسرے حصّے میں دونوں گول میز کانفرنسوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔جواس دور کی سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔

نواب چھتاری کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشخاص جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے

[۱] چودھری افضل حق''میرا افسانہ''ص ۲۸

حادثات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا قصد کر لیا کیونکہ انگریز افسروں کا رویّہ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت اہانت آمیز تھا۔نواب چھتاری کلکٹر سے ملاقات کے آداب کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں ملاقاتیوں کو خواہ کوئی ہو ٹاؤن ہال میں بٹھایا جاتا تھا۔ ٹاؤن کا ہال کا فاصلہ کلکٹر صاحب کی کوٹھی سے کم از کم ساٹھ گز ہوگا اور چپراسی کوٹھی کے برآمدے سے کپڑا ہلا کر ملاقاتی کو آواز دیتا اور یہ صاحب کو ہندا کی آواز پرافتاں وخیزاں چل پڑتے ہیں''۔ [۱]

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کا رویّہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ کتنا تحقیر آمیز تھا۔نواب صاحب نے صوبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیا تھا۔ وہ انگریزوں کی حکومت میں مختلف منصوبوں پر بھی فائز رہے تھے۔انہوں نے مختلف تحریکوں مثلاً گول میز کانفرنس، تحریک عدم تعاون اور انگریزوں کی ملکی پالیسی وغیرہ کو بڑے معروضی انداز میں بیان کیا ہے۔تحریک ترک موالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تحریک نے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جس کا اس سے پہلے سوائے چند حضرت کے فقدان تھا۔ اس سیاسی شعور سے ہندوستانیوں میں خود آرائی آئی۔ اس تحریک نے انگریزوں کے دماغ سے دعوا خدائی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ان کے مزاج میں اس تحریک نے اعتدال پیدا کیا۔ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کی طرف مائل کیا''۔ [۲]

''سرگذشت'' عبدالمجید سالک بٹالوی کی خودنوشت ہے۔ اس سرگذشت میں سیاسی اور ادبی ہندوستان بری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔سالک نے اپنی خودنوشت میں سیاسی معلومات فراہم کی ہیں۔اور اس عہد کے تمام واقعات اور حادثات کو پوری طرح شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔گاندھی اور رولٹ ایکٹ ۳۰/ مارچ ۱۹۱۰ء کی ملک ہڑتال، جلیانوالہ باغ کا حادثہ، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، تحریک عدم تعاوُن، مولانا محمد علی کا وفد یورپ کے لئے۔ مالویہ جی اور

[۱] نواب چھتاری ''یادایام'' ص ۴۰

شردھانند کی تحریک، سنگٹھن اور شدھی، امرتسر میں تنظیم کانفرنس جس کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے منعقد کیا تھا۔ بندے ماترم پر تاپ اور ملاپ کا اجراء، نہرو رپورٹ اور اس کا ردّعمل، اخبار انقلاب اور زمیندار کے مضامین، غرض کہ اس دور کی پوری ملکی اور ملّی تاریخ ان کے فکر وفن کا محور تھی۔ اس طرح سالک کی سرگذشت اپنے دور کے سیاسی حالات اور تحریکوں کا آئینہ دار ہے۔ سالک نے اپنی سرگذشت میں اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان میں قادر گرامی، محمد اقبال، گاندھی جی، محمد علی جناح، جواہر لال، رابندر ناتھ ٹیگور، مسز اینی بیسنٹ، خواجہ حسن نظامی، بیدل شاہجہاں پوری، محمد دین تاثیر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ سیاسی اور صحافتی تاریخ کے طور پر بھی سالک کی سرگذشت بہت اہم ہے۔

عبداللطیف بٹالوی نے اپنی سیاسی زندگی کی داستان ''لطیف کہانی'' کے نام سے قلم بند کی تھی۔ عبداللطیف بٹالوی کا نام ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں خصوصیت کا حامل ہے۔ اپنی خود نوشت میں عبداللطیف نے اہم سیاسی شخصیتوں مثلاً ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی وغیرہ کے اعمال وافعال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لطیف کی کہانی اس دور کی سیاسی تاریخ کی دستاویز ہے۔ اس خودنوشت میں انہوں نے ۱۹۱۹ء کی ہڑتال، شدھی اور نہرو رپورٹ، کانپور انکوائری کمیٹی رپورٹ، ۱۹۳۶ء کا لایکشن، زمینداروں کی حالت، یوپی کا تقسیم کا مسئلہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں نہرو، انصاری، سندر لال، شوکت علی اور پنڈت گوبند بلبھ پنت وغیرہ کے خطوط کو بھی درج کیا ہے۔ جس سے ان حضرات کی سیاسی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ عبداللطیف بٹالوی نے سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس خودنوشت میں ان کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''میں تمام سیاسی جماعتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت ملک خطرے میں ہے چائنا سر پر بیٹھا ہے معلوم نہیں کل کو کیا حشر ہوگا۔ میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے

درخواست کرتا ہوں کہ وہ کمیونسٹوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں اور اپنے اختلافات کو فی الحال بھول جائیں''۔ [۱]

ڈاکٹر راجندر پرساد نے ''اپنی کہانی'' کے نام سے خودنوشت تحریر کی۔ اس خودنوشت کا ترجمہ گوپی ناتھ امن نے کیا تھا اور ساہتیہ اکادمی دہلی نے پہلی بار مئی ۱۹۶۱ء میں اس کتاب کو شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد خود ایک بڑے سیاست داں تھے۔ انہوں نے آزادی کی تحریکوں میں گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزادی اور دوسرے سیاسی قائدین کے ساتھ رہ کر کام کیا تھا، اور ان تمام تجربات اور تحریکوں کا ذکر انہوں نے ''اپنی کہانی'' میں کیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ستیہ گرہ کی تحریک جاری تھی۔ باردولی میں زمین کا لگان بڑھانے کی وجہ سے ستیہ گرہ ہوا۔ باردولی ستیہ گرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''باردولی ستیہ گرہ خوب کامیاب رہا، حکومت نے اپنی طرف سے ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کی۔ لوگوں نے بھی جوش کے ساتھ اس جبر و تشدد کو برداشت کیا۔ سختیاں جھیلنے میں عوام کو پوری طرح کامیابی ملی، گاندھی جی کی دعا اور امداد تو شاملِ حال تھی ہی تحریک چلانے کا سارا بھار حقیقتاً سردار ولبھ بھائی پٹیل پر تھا۔ جنہوں نے اسے بڑی عقلمندی، استقلال، بے خوفی اور محنت سے چلایا تھا۔ سبھی پارٹیوں کے لوگوں نے انتہائی اہم تحریک سمجھا، سب نے مدد بھی دی''۔ [۲]

اس کتاب میں راجندر پرساد نے پہلی جنگ عظیم، رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک پنجاب میں ترکِ موالات، موپلہ بغاوت، ستیہ گرہ کی تیاری، چوراچوری کا سانحہ، سوراج پارٹی کا جنم، ہندو مسلم مسئلے، سائمن کمیشن کی آمد، گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا، نمک ستیہ گرہ، مسلم لیگ کا قیام وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ راجندر پرساد کی خودنوشت کا مطالعہ کرنے کے بعد سیاسی تحریکات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ راجندر پرساد کا تعلق گاندھی جی سے رہا ہے انہوں نے سیاسی تحریکوں میں گاندھی جی کا ساتھ دیا ہے۔ گاندھی جی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[۱] عبداللطیف بٹالوی ''لطیف کی کہانی'' ص ۲۱۳

[۲] راجندر پرشاد ''اپنی کہانی'' ص ۵۱۸

''میں وکالت تو زوروں سے کرتا رہا۔ مگر اب گاندھی جی سے بھی تعلق چھپنے والا نہیں تھا۔ رولٹ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد ملک میں ایک بڑی تحریک جاری ہوگئی۔ گاندھی جی نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لی۔ بہار سے واپسی کے بعد گاندھی جی نے رہنمائی کر کے کھیڑا کے کسانوں کا جن پر مال گذاری کا اضافہ تھا۔ اضافہ چھڑا دیا۔ اور ستیہ گرہ کا اہتمام کرنا پڑا تھا۔ جب گاندھی جی ۱۹۱۰ء میں کھیڑا کا دورہ کر رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ گجرات کے کسانوں کے اس ضلع میں دو تین دن تک گھوما پھرا تھا''۔ [۱]

ڈاکٹر راجندر پرساد موپلہ بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گاندھی جی کلکتہ سے مدراس کی طرف چلے گئے۔ اس دورے میں کہیں انہوں نے لنگوٹی پہننے کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی جو دورے میں ساتھ والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔ وہ دوسرے کئی لیڈروں کے ساتھ جن میں مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدّد، شری بھارتی کرشن اور تیرتھ شنکر اچاریہ بھی تھے۔ کراچی میں خلافت کانگریس کی تقریر اور فتوے کی تبلیغ کے لئے عدالت میں پیش کئے۔ اس مقدمے نے بھی ملک میں بڑی کھلبلی پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی نے صفائی میں جو بیان دیا اس کی وجہ سے اور ان صاحبان کے بیان کے سبب سے جو اس میں ملزم تھے، یہ ایک بڑا اہم قدم ہو گیا۔ آخر شری شنکر اچاریہ کو چھوڑ کر سب کو سزائیں ہوئیں''۔ [۲]

راجندر پرساد کی خودنوشت ''اپنی کہانی'' اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کو ائف کی آئینہ دار ہے۔

گاندھی جی نے اپنی خودنوشت انگریزی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ ''تلاشِ حق'' کے عنوان سے ڈاکٹر سیّد عابد حسین نے کیا تھا۔

گاندھی جی نے اپنی خودنوشت میں سیاسی رہنماؤں کی مختلف سیاسی تحریکوں میں شمولیت کا

[۱] راجندر پرشاد ''اپنی کہانی'' ص ۲۰۷۔۲۰۶

[۲] راجندر پرشاد ''اپنی کہانی'' ص ۲۰۸

تذکرہ کیا ہے۔ستیہ گرہ تحریک کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ستیہ گرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا ہے مجھے اس کے لئے کوئی نام نہیں ملتا تھا۔ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لئے انگریزی لفظ PASSIVE RESISTANCE (مقاومت مجہول) استعمال کرتے تھے، جب مجھے یورپیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا کہ PASSIVE RESISTANCE کے معنیٰ بہت محدود ہیں۔ یہ کمزوروں کی تلوار سمجھی جاتی ہے، اس میں نفرت کا مفہوم بھی آ سکتا ہے اور تشدد کی شکل میں ظاہر ہوسکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنیکی ضرورت پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان چیزوں سے بری ہے۔ اور اس کی ماہیت بالکل دوسری ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جدو جہد کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضرور ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سُوجھا۔ اس لئے میں نے ''انڈین اوپنین'' میں اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب سے اچھا نام تجویز کرے گا اسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ مگن لال گاندھی نے ''ست آگرہ'' (ست یعنی حق، آگرہ، ثبات) کا لفظ وضع کیا مگر میں نے سہولت کے خیال سے بدل کر ''ستیا گرہ'' کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس تحریک کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے''۔ [۱]

گاندھی جی کی تحریکوں کے سلسلے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''۱۹۰۸ء میں جب میں نے ''ہندوسوراج میں کھدّر کو ہندوستان کے روز افزوں افلاس کا علاج قرار دیا، اس وقت تک مجھے کبھی چرخہ یا کرگھا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں' میں نے یہ بات ایک بدیہی اصول کے طور پر پیش کی کہ جو چیز ہندوستان کو افلاس کی چکّی میں پیسنے کے بجائے اس نے گویا سوراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سوراج خود بخود مل جائے گا''۔ [۲]

۱ گاندھی جی ''ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ''تلاش حق'' پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء ص ۶۷۔۶۶

۲ گاندھی جی ''ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ''تلاش حق'' پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء ص ۲۸۴۔۲۸۳

گاندھی جی ترکِ موالات'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ریل میں ترکِ موالات کا رزولیوشن کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودے میں NON VIOLENT کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس موضوع سے متعلق ابھی میرے الفاظ کا ذخیرہ مکمل نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مجمع میں NON VIOLENT کا مترادف سنسکرت لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا کہ اس کے لئے کوئی اردو کا لفظ بتایئے۔ انہوں نے اس کا ترجمہ ''بااماں'' اور نان کوآپریشن کا ''ترکِ موالات'' تجویز کیا''۔ [۱]

گاندھی جی ''تحریک ترکِ موالات'' کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''میں نے اپنے ریزولیوشن میں ترکِ موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے یہ بات وجیارا کھو چار جی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا۔

''اگر ترک موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرنے کے لئے کیوں کی جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سوراج سے محروم ہے۔ اس کی چارہ جوئی کے لئے ترکِ موالات کرنا چاہئیے پنڈت نہرو بھی یہی چاہتے تھے کہ ریزولیوشن میں سوراج کے مطالبہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی اور اپنے ریزولیوشن میں سوراج کا مطالبہ بھی شامل کر لیا''۔ [۲]

مولانا ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM کے عنوان سے دو حصّوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کے ایک حصّے کا اُردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب نے ''ہماری آزادی'' کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کا نصف سے زیادہ حصہ ان کی خودنوشت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ باقی حصّہ مولانا کی سیاسی تحریکوں سے وابستگی پر مشتمل ہے۔

[۱] گاندھی جی ''ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین'' ''تلاش حق'' ص ۲۹۵

[۲] گاندھی جی ''ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین'' ''تلاش حق'' ص ۲۹۶

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی ''میری کہانی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے گول میز کانفرنس، گاندھی جی سے ملاقات، درجۂ نو آبادیات، کامل آزادی، انگریز حکومت کی کارگزاری کے علاوہ سیاسی تحریکوں اور ان تحریکوں میں اپنی شمولیت کا ذکر مفصّل طور پر کیا ہے۔

پنڈت نہرو ''میری کہانی'' میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''ہندوستان کا سیاسی اتحاد کو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی گئیں اس کا پس منظر ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعدازاں جب یہ اتحاد جذبۂ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی، جو ہماری ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے''۔ [۱]

پنڈت نہرو برطانوی حکومت کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست، اور مطلب پرست عناصر کی ہمّت افزائی کرتی ہے مگر شاید یہ بھی ہمارے ملک کے لئے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے، جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے''۔ [۲]

مولانا حُسینؒ احمد مدنی نے ''نقشِ حیات'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت دو جلدوں میں مرتب کی تھی۔ ''نقشِ حیات'' کا ایک چوتھائی حصّہ مولانا کے شب و روز کی زندگی، والدین، اعزّہ اور لواحقین کے حالات پر مشتمل ہے۔ باقی صفحات میں ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم اور استبداد کی داستان پیش کی گئی ہے مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ان کے اجداد بے یار و مددگار ہو گئے تھے''۔

''نقشِ حیات میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[۱] پنڈت جواہر لال نہرو ''میری کہانی'' جلد دوم اشاعت چہارم ص ۳۶۸

[۲] پنڈت جواہر لال نہرو ''میری کہانی'' جلد دوم اشاعت چہارم ص ۲۹۶

''مجاہدین یا ان سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر مظالم ایذا رسانی، توہین وتذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلافِ انسانیت اور خلافِ تمدن کاروائیاں کی جاتی تھیں۔ ان کو سُنکر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ برطانیہ کی تاریخ ان وحشیانہ اعمال کی وجہ سے نہایت گندی اور سیاہ ہے۔ پولیٹکل قیدیوں کے ساتھ جن امور کا تصور بھی متمدن حکومتوں میں ناجائز شمار کیا جاتا ہے ان پر عمل درآمد کرنے میں انگریز ان شریف النفس انسانوں کیلئے جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے اور ایسے ایسے ملعون اور منحوس معاملات ان شرفاء کے ساتھ عمل میں لایا کرتے تھے کہ بہترین اخلاقی قیدیوں کے ساتھ بھی گوارا نہیں کئے جاتے تھے''۔ [۱]

مولانا حسین احمد مدنی ''نقشِ حیات'' میں ایک اور مقام پر انگریزوں کی ذہنی پستی، اور اخلاقی گراوٹ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''انگریز ہندوستان میں آکر ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی اپنے ملک میں جرأت کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہوسکتا''۔ [۲]

مولانا نے انگریزوں کے مظالم کے علاوہ، انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے انخلاء تک پوری تاریخ بیان کی ہے۔ اس میں انہوں نے دیوبند کے اکابرین کی آزادی کی تحریک میں شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مہاجر مکّی کی گرفتاری کے حالات مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خودنوشت میں تحریر کئے ہیں۔

[۱] مولانا حسین احمد مدنی ''نقش حیات'' جلد دوم ص ۳۶

[۲] مولانا حسین احمد مدنی ''نقش حیات'' جلد اول ص ۱۶۶

سَوانح عمریاں لکھنے کا تصوّر سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہودیوں نے ابتداء میں اپنے اسلاف اور قدماء کے حالاتِ زندگی جمع کئے اس کے بعد آہستہ آہستہ اہلِ روما میں بھی یہ صنف رواج پانے لگی۔ اس طرح دن بدن سوانح عمریاں لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی ''پلوٹارک'' کی ہے۔ اس سوانح عمری کو بظاہر اعلیٰ اور وقیع قرار دیا گیا ہے۔

الطاف فاطمہ ''فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء'' میں سوانح نگاری کے سلسلے میں لکھتی ہیں:

''سوانح نگاری کسی فردِ واحد کی شخصیت کو منظرِ عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔ اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ہیرو کے محاسن اور معائب کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں''۔ [۱]

کامیاب سوانح نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ جس شخصیت پر قلم اٹھا رہا ہے اس کی زندگی کا کوئی بھی اہم گوشہ ضبطِ تحریر میں لانے سے نہ رہ جائے اور وہ معروضی ہو کر اس کی شخصیت اور سیرت کا بھرپور جائزہ لے۔

الطاف فاطمہ ایک اور مقام پر فنِ سوانح نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''فن کار کے لئے اس کے فن پارے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے ایک ذریعۂ نجات بن جاتا ہے۔ دنوں برسوں کے ڈھکے چھپے خیالات اور جذبات اور جو فنکار کی روح و ذہن میں موجزن ہوتے ہیں نکاس کا راستہ پالیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ایک ایسے بار عظیم سے سبکدوش ہو جاتا ہے جو اس کے قلب و ذہن کو کچلتا ہوتا ہے''۔ [۲]

اُردو فنِ سوانح نگاری کی ابتداء سرسیّد احمد خان کے رفقاء کی رہین منت ہے۔ سرسید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر رفقاء کا ایک ایسا حلقہ تیار کیا تھا جنہوں نے اپنے مخصوص

۱ الطاف فاطمہ ''فن سوانح نگاری کا ارتقاء'' ۱۹۷۴ء ص ۱۸

۲ الطاف فاطمہ ''فن سوانح نگاری کا ارتقاء'' ۱۹۷۴ء ص ۲۲

میدانوں میں قلم کے جوہر دکھائے۔اس دور میں جہاں ادب کی دیگر اصناف کوفروغ حاصل ہوا وہاں فن سوانح نگاری پر بھی توجہ مبذول کی گئی۔

سرسیّد کے رفقاء میں مولانا شبلی نے خصوصیت سے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کو اپنا میدان بنایا۔حالی نے تنقید نگاری اور شاعری کے علاوہ سوانح عمریاں بھی تصنیف کیں۔انہوں نے یادگار غالب، حیات سعدی، اور حیات جاوید تصنیف کی۔شبلی کے اسلاف کے عظیم کارناموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، اوران کے حالات قلم بند کئے۔

سوانح نگاری میں دارالمصنفین کا سوانحی سلسلہ بھی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت کا حامل ہے۔اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ مرزا حیرت دہلوی اور عبد الرزاق کانپوری کے یہاں بھی حالی اور شبلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر معین عقیل مذکورہ بالا سوانح نگاروں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اِن سوانح نگاروں کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ ان کے پیش نظر سوانح عمری کو اس مقصد کے لئے ذریعہ اور وسیلہ بنایا گیا ہے۔ان سب کی نظریں اشخاص پر، اشخاص کی حیثیت سے کم پڑتی ہے۔ان کے دماغی کارناموں کے اس حصّے پر زیادہ پڑتی ہے۔جس سے احیائے قومی کے لئے مواد حاصل کیا جاسکتا ہے''۔[۱]

اس باب میں ہم نے ان سوانح عمریوں کو شامل کیا ہے جو یا تو سیاسی شخصیتوں پر لکھی گئیں یا پھر جن شخصیتوں کا تعلق ملک کی آزادی سے رہا۔

''وقار حیات'' محمد اکرام اللہ خاں ندوی نے مرتب کی تھی جو ۱۹۲۸ء میں منظر عام پر آئی۔ قائداعظم محمد علی جناح پر متعدد کتابیں لکھی گئیں ان کتابوں میں سے زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں جو فنّی اور سیاسی اعتبار سے کامیاب اور بھرپور نظر آتی ہیں۔''حیات محمد علی جنّاح'' رئیس احمد جعفری

[۱] معین عقیل ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۴۶۷

نے لکھی تھی جو ۱۹۴۶ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اسی طرح ایک سوانح عمری خالد اختر افغانی نے ''حالات قائداعظم'' کے عنوان سے تحریر کی تھی یہ کتاب بھی بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ ''ایشیاء کی سب سے بڑی شخصیت ''محمد علی جناح'' کے نام سے محمد عبداللہ منہاس نے ایک سوانح تصنیف کی جو امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قائداعظم کی شخصیت کو سیاسی اور قومی رہنما کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے اس طرح کتابیں سوانح عمریوں کی شکل میں کثرت سے لکھی گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام جنگِ آزادیِ کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک کثیر الجہات اور مجمع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ ابوالکلام آزاد پر بھی کثرت کے ساتھ کتابیں اور سوانح عمریاں تصنیف کی گئیں۔ ان کتابوں میں مولانا کے سیاسی افکار اور نظریات کو بالخصوص بیان کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا شائق احمد عثمانی کی کتاب ''اما الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد'' ہے جو ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

معین عقیل مذکورہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے ابتدائی صفحات ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے خلاصے پر مشتمل ہے۔ ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں اس کے بعد ۱۹۲۳ء کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور صحافتی زندگی، علم و فضل اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے''۔ [۱]

عبداللہ بٹ نے ''ابوالکلام آزاد'' کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی حیات، تصنیفات اور ان کے سیاسی کارناموں پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسری کتاب جو مولانا آزاد پر مختلف افراد کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے لاہور سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ ''ابوالکلام آزاد''

[۱] معین عقیل ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' ص ۴۵۷

کے نام سے روشن نے مولانا آزاد کے خاندانی حالات، سوانح حیات، علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے تعارف پر مبنی کتاب تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے مفصل حالات الہلال کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی اور خطبۂ صدارت شامل ہے۔ منشی عبدالرحمٰن شیدا نے ''سوانح ابوالکلام آزاد'' تصنیف کی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کے ابتدائی حالات سے ۱۹۴۰ء تک کے حالات علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آصف علی نے ''سوانح ابوالکلام آزاد'' تحریر کی۔ یہ بھی مولانا آزاد کے علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آخر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس منعقدہ رام گڑھ کا خطبۂ صدارت بھی شامل ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ابوسعید بزمی نے ''مولانا ابوالکلام'' تحریر کی جو لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی علمی، مذہبی، سیاسی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

علامہ اقبال پر بھی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ علامہ اقبال شاعر، فلسفی اور مفکّر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی تھے۔ انہیں اپنے ملک سے بے پایاں محبّت اور لگاؤ تھا۔ محمد دین تاثیر نے ''اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک ایک کتاب لکھی تھی، جو ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ عنایت اللہ نے ''حیات اقبال'' تصنیف کی جو ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اقبال پر متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں اقبال کے سیاسی اور ادبی کارناموں کا تذکرہ بالخصوص ملتا ہے۔ سوانح عمریوں کے علاوہ چند ایسی کتابیں بھی ضبط تحریر آئیں جن میں علماء اور قائدین کے تذکرے لکھے گئے ان کو مجموعی سوانح کے ضمن میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔

مولانا محمّد میاں کی کتاب ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات اور قائدین کی سیاسی و مذہبی فکر و شعور کا ذکر ملتا ہے۔ ان علماء میں مولانا محمود الحسن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبیداللہ سندھی،

مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے سیاسی نظریات سامنے آتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی پر محمد سرور کی ایک کتاب ملتی ہے جس کا سن اشاعت ۱۹۴۳ء درج ہے۔اس کتاب میں عبید اللہ سندھی کا سیاسی نظریہ اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مہادیو ڈیسائی نے ''خدائی خدمت گار'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا اُردو ترجمہ محمود علی خان نے کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں صوبہ سرحد اور وہاں کے باشندوں کی زندگی کے اہم واقعات سیاسی اور مذہبی خیالات کو مکالموں کی شکل میں تحریر کیا ہے۔

محمد عنایت اللہ نے ''تذکرہ فرنگی محل'' تصنیف کی تھی۔ جو لکھنؤ سے ۱۹۳۰ء شائع ہوئی۔ اس میں قدماء اور دورِ حاضر کے علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے وہ علماء بھی شامل تھے جو اس دور کے سیاسی تحریکوں میں انگریزوں کے خلاف حصّہ لے رہے تھے۔

سیاسی رہنماؤں، مبلّغین، قائدین پر سوانحی کتب کا سلسلہ بھی اس ضمن میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس طرح کی کتب میں مہری کی کتاب ''ہندوستانی لیڈرز'' ہے۔اس کتاب میں کانگریس اور مسلم لیگ سے متعلق سیاسی رہنماؤں کا مختصراً تذکرہ کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔جگدیش سنگھ نے ''محبانِ وطن'' تحریر کی تھی۔اس میں ہندوستانی رہنماؤں کا ذکر کیا گیا ہے، یہ کتاب بھی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ بادشاہ حسین نے ''مشاہیر ہند'' دو جلدوں میں تحریر کی تھی، جو ۱۹۳۷ء حیدر آباد دکن سے طبع ہوئی تھی۔اس میں مختلف نظریات و مذاہب کے حامل قومی و سیاسی اکابرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''باغی لیڈرز'' کے نام سے قوم پرست قائدین کے حالاتِ زندگی مختلف اکابرین نے تحریر کئے تھے۔اس کتاب کے مرتبین میں آچاریہ کرپلانی، کے .ایم منشی، اور یوسف میر علی شامل تھے۔اس میں اس دور کے اہم اور نامور قوم پرستوں کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی لاہور ہی سے شائع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے، سروجنی نائیڈو، ٹیگور، سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، ڈاکٹر ذاکر حسین، مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں وغیرہ سیاسی رہنماؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو سوانح عمریوں کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں۔ ان کتابوں میں سیاسی رہنماؤں کے کارناموں نیز ملک وملت کے تئیں ان کی سیاسی خدمات کا ذکر ملتا ہے۔